جلوۂ ایثار

حب وطن کا ایک دلچسپ قصہ

مصنفہ

منشی نواب رائے

مصنف

سوز وطن، کشنا وغیرہ

باہتمام بینچکوڑی مترا پرنٹر و پبلشر

انڈین پریس الہ آباد میں طبع ہوا

سنہ ۱۹۱۲ع

قیمت ۴ھ

بس میں تشکیل بہت دن ہوئے جبکہ شیویا اپنے
جگر کے ٹکڑے روہتاش کو گنگا کی گود میں سونپنے
کے لئے لیگئی تھی۔ رات بڑی بھیانک تھی۔ اور شیویا کی آنکھیں
ساون کی طرح برس رہی تھیں۔ اُسکا بلاپ سنکر گنگا کی لہریں اُمڈ آئیں
اور دیوتاؤن کے جگر پارہ پارہ ہوگئے مگر شیویا کے سیلاب اشک
میں بھی ہری چند کے پیر نہ ڈگمگائے۔ اُسوقت آکاش سے دیوتاؤن
نے پھول برسائے۔ اور تینوں لوک میں جے جے کار کی صدا بلند
ہوئی۔ وہ دن بھارت کے لئے بہت مبارک تھا۔

یہہ ناچیز تصنیف اُسی دھرم بیر ہری چند کے نام پر
معنون کرتا ہوں۔ [illegible]

پہلی فصل

وندھیاچل پہاڑ آدھی رات کی ڈراؤنی تاریکی میں کالے دیو کی طرح کھڑا تھا۔ اُسپر اُگے ہوئے چھوٹے چھوٹے درخت ایسے نظر آتے تھے گویا اُسکی جٹائیں ہیں۔ اور اشٹ بھجی دیوی کا مندر جسکے کلس پر سیاہ پتاکے ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے لہرا رہے تھے اِس دیو کا سر معلوم ہوتا تھا۔ مندر میں ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ نظر آتا تھا جسپر کسی دُھندلے تارے کا گمان ہوتا تھا۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ چاروں طرف ہیبتناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گنگا جی کی سیاہ لہریں پہاڑ کے نیچے سکون بخش روانی کے ساتھ بہ رہی تھیں۔ اور اُنکے بہاؤ سے ایک دلآویز نغمہ کی صدا نکل رہی تھی۔ جابجا کشتیوں پر۔ اور کناروں کے آس پاس ملاحوں کے چولھوں کی آنچ نظر آجاتی تھی۔ ایسے وقت میں ایک سفید پوش عورت اشٹ بھجی دیوی کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسکا متین چہرہ زرد تھا۔ اور بشرے سے مُبرا فت ٹپک رہی تھی۔ اُسنے دیر تک سر جھکائے رہنے کے بعد کہا :-

"ماتا! آج بیس سال سے کوئی منگل کا دن ایسا نہیں گذرا کہ مینے تمہارے چرنوں پر سر نہ جھکایا ہو۔ ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا کہ مینے تمہارے چرنوں کا دھیان نہ کیا ہو۔ تم جگت تارنی مہارانی ہو۔ مگر تمہاری اتنی سیوا کرنے پر بھی میرے دل کی آرزو پوری نہ ہوئی تمہیں چھوڑ کر اب کہاں جاؤں۔"

ماتا! مینے سیکڑوں برت رکھے دیوتاؤں کی اپاسنا کی ... [illegible]

ور بھگ نہ پورا ہوا۔ تب تمہارے سرن آئی۔ اب تمھیں چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ تمنے سدا
ے بھگتوں کی مرادیں پوری کی ہیں۔ کیا میں تمہارے دربار سے نراس جاؤں۔"

سبا ما اسی طرح دیر تک بنتی کرتی رہی۔ یکایک اُسکے دل پر ایک بیخبر کر دینے والی
کا غلبہ ہوا۔ اُسکی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اور کان میں آواز آئی۔
"سبا ما! میں تجھسے بہت خوش ہوئی۔ مانگ کیا مانگتی ہے۔"
سبا ما کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اور کلیجہ دھڑکنے لگا۔ آج بیس سال کے
رانی نے درشن دئے۔ کانپتے ہوئے بولی۔ "جو کچھ مانگونگی وہ مہارانی دیگی۔"
"ہاں ملیگا!"
"مینے بڑی تپسیا کی ہے۔ اسلئے بڑا بھاری بردان مانگونگی۔"
"کیا لیگی؟ کُبیر کا دھن؟"
نہیں!
"اندر کا بل؟"
نہیں!
سرسوتی کی ودیا؟
نہیں!
پھر کیا لیگی؟
سنسار کا سب سے اُتم پدارتھ!
وہ کیا ہے؟"

"جو کُل کا نام روشن کرے؟"

"نہیں"

"جو ماں باپ کی سیوا کرے؟"

"نہیں"

"جو وِدّیا وان اور بلوان ہو؟"

"نہیں"

"پھر سپوت بیٹا کسے کہتی ہے؟"

"جو اپنے دیس کا اُپکار کرے۔"

"تیری بُدھی کو دھنیہ ہے۔ جا تیری اِچھا پوری ہو گی"

دوسری فصل

ویراگ

منشی سالگرام بنارس کے پُرانے رئیس تھے۔ پیشہ وکالت تھا۔ اور موروثی جائداد وافر تھی۔ دشاسمیدھ گھاٹ پر اُنکا عالی شان مکان آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ فیاض ایسے کہ پچیس تیس ہزار سالانہ کی آمدنی خرچ کو کافی نہ ہوتی۔ سادھوؤں اور برہمنوں کے پکّے معتقد۔ جو کچھ کماتے برہم بھوج اور سادھوؤں کی تواضع وتکریم میں صرف ہو جاتا۔ شہر میں کوئی سادھو کوئی مہاتما آجائے وہ منشی جی کا مہمان تھا۔ سنسکرت کے ایسے عالم کہ بڑے بڑے پنڈت نکا لوہا مانتے۔ ویدانت کے اصولوں کے پابند تھے۔ اور طبیعت کا میلان ویراگ کی طرف تھا۔

منشی جی کو خلقۃً بچّوں سے بہت اُنس تھا۔ سارے محلے کے بچّے اُنکی شفقت اور پیار سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ جب وہ گھر سے نکلتے تو بچّوں کا ایک لشکر ساتھ ہو ایک بار کوئی سنگدل ماں اپنے بچے کو مار رہی تھی۔ لڑکا بلک بلک کر روتا تھا۔ منشی جی سے نہ رہا گیا۔ دوڑے۔ بچے کو گود میں اُٹھالیا۔ اور عورت کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ اُسدن سے اُس عورت نے بچے کو مارنے کی قسم کھالی۔ جو شخص غیروں کے لڑکوں کا ایسا دلدادہ ہو وہ اپنے بچّے کو کتنا پیار کریگا اُسکا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب سے بیٹا پیدا ہوا منشی جی سب کام کاموں سے کنارہ کش ہو گئے۔ کہیں لڑکے کو ھنڈولے میں جھلا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ کہیں اُسے ایک خوشنما سیر گاڑی میں بٹھا کر خود کھینچ رہے ہیں۔ ایک لمحہ بھی اُسے اپنے پاس سے جدا نکرتے۔ لڑکے کی محبّت میں اپنے تئیں بھول گئے

یہی مرکزِ گفتگو تھا۔ جو سنتا افسوس کرتا۔ کیا امیر۔ کیا غریب یہ ماتم عام تھا۔ اُنکی ذات سے چاروں طرف زندہ دلی پھیلی رہتی تھی۔ اب ایک ماتم چھایا ہوا تھا۔ جن گلیوں سے وہ بچوں کی فوج لیکر نکلتے تھے وہاں اب خاک اڑ رہی تھی۔ بچے بار بار اُنکے پاس آنے کے لئے روتے اور ضد کرتے۔ اُن بیچاروں کو کیا خبر تھی کہ اب وہ محفل ویران ہوگئی۔ اُنکی مائیں آنچل سے مُنہ ڈھانپ ڈھانپ کر روتیں جیسے اُنکا کوئی عزیز مرگیا ہو۔

یوں تو منشی جی کے غائب ہونیکا رونا سبھی رو رہے تھے۔ مگر سب سے گاڑھے آنسو اُن اڑھتیوں اور سوداگروں کی آنکھوں سے نکلتے [illegible] جنکا ابھی حساب کتاب نہیں ہوا تھا۔ دس بارہ دن تو اُنھوں نے جوں توں کر [illegible] مگر آخر کب تک۔ ایک ایک کرکے حساب کی فردیں پیش ہونے لگیں۔ کسی برہم بھوج [illegible] دو سو روپیہ کا گھی آیا ہے اور قیمت نہیں دی گئی۔ کہیں سے دو سو من میدہ آیا ہوا ہے۔ [illegible] بزاز کا ہزاروں کا حساب ہے۔ مندر بناتے وقت ایک مہاجن سے بیس ہزار قرض لیا گیا [illegible] وہ ابھی جوں کا توں پڑا ہوا ہے۔ مطالبات کا تو یہ حال تھا۔ اثاثہ کا یہ حال کہ بجز ایک عالی شان عمارت اور اُسکے لوازمات کے کوئی ایسی جائداد نہ تھی جس سے کوئی رقم کثیر کھڑی ہو سکے۔ اسکے سوا اب کوئی تدبیر نہ تھی کہ علاقہ نیلام پر چڑھا دیا جاوے۔ اور اُسکے محاصل [illegible] یہ مطالبات ادا کئے جائیں۔

بیچاری شیاما سر جھکائے بورئے پر بیٹھی ہوئی [illegible] پرتاپ چندر اپنے لکڑی کے گھوڑے پر سوار آنگن میں ٹخ ٹخ کر رہا تھا کہ پنڈت [illegible] رام شاستری جو خاندان کے پروہت تھے مُسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اُنھیں [illegible] دیکھکر مایوس شیاما چونککر اُٹھ بیٹھی کہ شاید یہ کوئی خوش خبری لائے ہیں۔ اُنکے [illegible] ن بچھا دیا۔ اور اُمید وارنگاہوں سے دیکھنے لگی۔ پنڈت جی آسن پر بیٹھے اور سنگھنی سونگھ [illegible] ے بولے تم نے مہاجن کا

[illegible] چلیں؟"

شیاما۔ (سادہ لہجے میں) "ہاں دیکھا تو۔"

سوشے رام۔ سنکٹ بڑی گہری ہے۔ منی جی سے آگا پیچھا کچھ نہ سوچا۔ اپنے یہاں کوئی حساب کتاب نہ رکھا۔"

شیاما۔ ہاں اچھو یہ رقم گہری ہی ہے۔ نہیں تو اتنا اتنا روپیہ ایک ایک بھوج میں اٹھ گیا ہے۔"

سوشے رام۔ سب دن برابر نہیں جاتے۔"

شیاما۔ اب تو جو ایشور کرے گا وہ ہوگا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

سوشے رام۔ ہاں ایشور کی اچھا تو مول ہی ہے مگر اپنے بھی کچھ سوچا ہے۔"

شیاما۔ ہاں۔ علاقہ نیلام کر دونگی۔"

سوشے رام۔ رام رام۔ یہ کیا کہتی ہو۔ علاقہ بک گیا تو پھر بات کیا رہجائیگی۔"

شیاما۔ اسکے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے۔"

سوشے رام۔ بھلا علاقہ [illegible] سے نکل گیا تو تم لوگوں کا گزر بسر کیسے ہوگا۔"

شیاما۔ ہمارا ایشور [illegible] ہے۔ وہی بیڑا پار لگا دے گا۔

سوشے رام۔ یہ تو بڑے [illegible] کی بات ہوگی کہ ایسے پدری آدمی کے لڑکے بلبلا کے ٹکڑا اٹھائیں۔"

شیاما۔ ایشور کو یہی [illegible] تو کسی کا کیا بس؟"

سوشے رام۔ بھلا میں [illegible] بتلاؤں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

شیاما۔ ہاں بتلائیے [illegible] اپکار ہوگا۔"

سوشے رام۔ پہلے تو ایک [illegible] لکھ کر کلکٹر صاحب کو دیدو کہ مالگزاری [illegible]

[illegible] اور چھوڑ دو ہم جو چاہیں گے کریں گے [illegible]

حساب دیکھا ؟"

سُبا ما۔ (مایوسانہ لہجہ میں) "ہاں دیکھا تو"

موٹے رام۔ "رقم بڑی گہری ہے۔ منشی جی نے آگا پیچھا کچھ نہ سوچا۔ اپنے یہاں کوئی حساب کتاب نہ رکھا۔"

سُبا ما۔ "ہاں اب تو یہ رقم گہری ہی ہے۔ نہیں تو اتنا اتنا روپیہ ایک ایک بھوج میں اُٹھ گیا ہے۔"

موٹے رام "سب دن برابر نہیں جاتے۔"

سُبا ما۔ "اب تو جو ایشور کرے گا وہ ہوگا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

موٹے رام۔ "ہاں ایشور کی اِچھا تو مول ہی ہے مُدا تمنے بھی کچھ سوچا ہے۔"

سُبا ما۔ "ہاں۔ علاقہ نیلام کر دونگی۔"

موٹے رام۔ "رام رام۔ یہہ کیا کہتی ہو۔ علاقہ بک گیا تو پھر بات کیا رہجائیگی۔"

سُبا ما۔ "اسکے سوا ک[illegible] تدبیر نہیں ہے۔"

موٹے رام۔ بھلا [illegible] سے نکلگیا تو تملوگوں کا گذر بسر کیسے ہوگا۔"

سُبا ما۔ ہمارا ایشو[illegible]۔ وہی بیڑا پار لگا دے گا۔

موٹے رام۔ "یہہ تو بڑ[illegible]س کی بات ہوگی کہ ایسے اُپکاری آدمی کے لڑکے بالے دکھہ اُٹھا ئیں۔"

سُبا ما۔ "ایشور کو یہی [illegible] تو کسی کا کیا بس ؟"

موٹے رام۔ "بھلا میں [illegible] بتاؤں کہ سانپ بھی مرجاے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

سُبا ما۔ "ہاں بتلائیے [illegible] اپکار ہوگا۔"

موٹے رام۔ "پہلے تو ایک د[illegible] لکھوا کر کلکٹر صاحب کو دیدو کہ مالگذاری ما پھ کی جاے۔ باقی روپیہ کا بندوبس[illegible]ے اوپر چھوڑ دو۔ ہم جو چاہیں گے کریں گے۔ مگر الا کے پر

آنچ نہ آنے پائیگی۔

سُباما۔" کچھ معلوم تو ہو آپ اتنا روپیہ کہاں سے لائیں گے؟"

موٹے رام۔ تمہارے لئے روپیے کا کیا کلیان۔ منسی جی کے نام پر بالا لکھا پڑھی کے پچاس

ہجار روپیہ کا بندوبست ہوجانا کوئی بڑی بات نہیں سچ تو یہ ہے کہ روپیہ رکھا ہوا ہے۔

تمہارے مُنہ سے ہاں نکلنے کی دیر ہے۔"

سُباما۔" شہر کے رئیسوں نے جمع کیا ہوگا۔"

موٹے رام۔" ہاں بات کی بات میں روپیہ جمع ہوگیا۔ صاحب کا اسارہ بہت تھا۔"

سُباما۔ (کچھ سوچکر) معافی کی درخواست مجھ سے نہ لکھوائی جائیگی۔ اور نہ اپنے پتی کے

نام پر قرض لینا چاہتی ہوں۔ میں سب کا ایک ایک پیسہ علاقہ سے ادا کر دونگی۔"

یہہ کہکر سُباما نے رکھائی کے ساتھ مُنہ پھیر لیا۔ اور اُسکے زرد اور افسوسناک چہرہ

پر ہلکا سا غصہ دکھائی دیا۔ موٹے رام نے دیکھا بات بگڑا چاہتی ہے تو سنبھلکر بولے" اچھا

جیسی تمہاری مرجی۔ اسمیں کوئی جبر جبتی نہیں ہے۔ مُدا ہمنے تمکو کسی طرح کا دُکھ اُٹھاتے

دیکھا تو اُس دن پرے ہوجائیگا بس اتنا سمجھ لو۔"

سُباما۔" تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں اپنے پتی کے نام پر دوسروں کے احسان کا بوجھ رکھوں۔

میں اسی گھر میں جل مرونگی۔ فاقے کرتے کرتے مرجاؤنگی مگر کسی کا احسان نہ اُٹھاؤنگی۔"

موٹے رام۔" چھی چھی تمہارے اوپر اوسان کون کر سکتا ہے۔ کیسی بات مُنہ سے نکالتی ہو۔

کرج لینے میں کوئی سرم نہیں ہے۔ کون رئیس ہے جسپر لاکھ دو لاکھ کا کرج نہو۔"

سُباما۔" مجھے یقین نہیں آتا کہ اس قرض میں احسان شامل نہیں ہے۔"

موٹے رام۔ سُباما! تمہاری بدھ کہاں گئی ہے۔ بھلا تم سب طرح کے دُکھ اُٹھاؤگی

مگر کیا تمھیں اس بالک پر ترس نہیں آتا۔"

موٹے رام کی یہہ چوٹ کاری پڑی۔ سُباما آبدیدہ ہوگئی۔ اور بیٹے کی طرف پُر حسرت نگاہوں سے دیکھا۔ اِس بچّے کے لئے کون کون سی تپسیا نہیں کی۔ کیا اب اُسکی تقدیر میں دُکھ اُٹھانا لکھا ہے۔ جو پودھا کل ہوا کے تیز جھونکوں سے بچایا جاتا تھا۔ جسپر آفتاب کی تیز کرنیں نہ پڑنے پاتی تھیں۔ جو ترو تازگی کے ھنڈولے میں جھول رہا تھا۔ کیا وہ آج اس جلتی ہوئی دھوپ اور اس آگ کی لپٹ میں مرجھائیگا۔ سُباما کئی منٹ تک اسی فکر میں بیٹھی رہی۔ موٹے رام دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اب بازی مار لی۔ اتنے میں سُباما نے سر اُٹھایا اور بولی۔ جسکے باپ نے لاکھوں کو جلایا کھلایا وہ دوسروں کا آسریت نہیں بن سکتا۔ اگر آپ کا دھرم اُسکی مدد کرے گا تو وہ خود دس کو کھلا کر کھائے گا۔ (لڑکے کو بلاتے ہوئے) بیٹا۔ ذرا یہاں آؤ۔ کل سے تمہاری مٹھائی بند۔ دودھ گھی سب بند ہو جائے گا۔ روؤ گے تو نہیں" یہہ کہکر اُس نے بیٹے کو پیار سے گود میں بٹھایا۔ اور اُس کے گلابی رخساروں سے پسینہ پونچھ کر ایک بوسہ لے لیا۔

پرتاپ"۔ کیا کہا کل سے مٹھائی بند ہو گی۔ کیوں؟ کیا حلوائی کی دوکان میں مٹھائی نہیں ہے۔"

سُباما" مٹھائی تو ہے مگر اُسکا روپیہ کون دیگا۔"

پرتاپ۔ ہم بڑے ہونگے تو اُسکو بہت سا روپیہ دینگے۔ چل ٹخ ٹخ! دیکھو اماں کیسا تیز گھوڑا ہے۔" سُباما کے آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے۔ افسوس! کیا اس حُسن و نزاکت کے پُتلے پر ابھی سے افلاس کی مصیبتیں آجائینگی۔ نہیں نہیں! میں خود سب بُھگت لونگی۔ مگر اپنے پیارے بچے پر مصیبت کی پرچھائیں نہ آنے دونگی۔ ماں تو یہہ خیال کر رہی تھی باقی رہ پرتاپ اپنے مُنہ زور بدلگام اسپ چوبیں کو زیر کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا بچے بچے

ہوتے ہیں۔ دل کے بادشاہ!

الغرض موٹے رام نے بہت کچھ جال پھیلایا۔ بہت فصاحت و بلاغت صرف کی۔ مگر شباما نے ایک دفعہ نہیں کرکے ہاں نہ کی۔ اُسکی اس وضعداری کا تذکرہ جس نے سُنا واہ واہ کی۔ لوگوں کے دل میں اُسکی عزت دوچند ہوگئی۔ اُس نے وہی کیا جو ایسے سیر چشم اور دریا دل آدمی کی بیوی کے شایاں شان تھا۔

اسکے پندرھویں دن علاقہ نیلام پر چڑھا۔ پچاس ہزار کی رقم وصول ہوئی۔ کل مطالبے چکا دئے گئے۔ گھر کے بے ضرورت سامان فروخت کر دئے گئے۔ مکان میں بھی شباما نے اندر سے اونچی اونچی دیواریں کھینچوا کے دو علیحدہ علیحدہ درجے کر دئے۔ ایک میں خود رہنے لگی۔ اور دوسرا کرایہ پر اُٹھا دیا۔

تیسری فصل

نئے پڑوسیوں سے میل جول

منشی سجیون لال جنھوں نے سُبا کا مکان کرایہ پر لیا تھا اعلیٰ درجہ کے روشنخیال آدمی تھے۔ پہلے ایک سرکاری عہدہ پر ممتاز تھے۔ مگر اپنی آزاد طبیعت کے باعث افسرونکو خوش نہ رکھ سکے۔ یہانتک کہ اُنکی ناراضی سے تنگ آکر استعفیٰ دیدیا۔ دوران ملازمت میں تھوڑا سا سرمایہ فراہم کر لیا تھا۔ نوکری چھوڑتے ہی ٹھیکہ داری کی طرف رجوع ہو گئے۔ اور اپنی محنت اور جانفشانی سے تھوڑے ہی عرصہ میں اچھی خاصی حیثیت بنا لی۔ اسوقت اُنکی آمدنی چار پانچسو کی اوسط سے کم نہ تھی۔ کچھ ایسی معاملہ فہم طبیعت پائی تھی کہ جس تعمیر میں ہاتھ لگاتے نفع کے سوا نقصان نہوتا۔

منشی سجیون لال کا کُنبہ بہت بڑا نہ تھا۔ اولادیں تو ایشور نے کئی دیں۔ مگر وہ سب بچپنے ہی میں داغ مفارقت دیگئی تھیں۔ اب اسوقت ماں باپ کے آنکھوں کی پُتلی صرف ایک لڑکی تھی۔ اُسکا نام برج رانی تھا۔ وہی والدین کی زندگی کا سہارا تھی۔

پرتاپ چندرا اور برج رانی میں پہلے ہی دن سے دوستی شروع ہو گئی۔ آدھ گھنٹہ میں دونوں چڑیوں کی طرح چہکنے لگے۔ برجن نے اپنی گڑیاں۔ کھلونے۔ باجے دکھائے۔ پرتاپ نے اپنی کتابیں۔ قلم اور تصویریں پیش کیں۔ برجن کی ماں (سوسیلا) نے پرتاپ کو گود میں لے لیا۔ اور خوب پیار کیا۔ اُس دن سے وہ روز شام کو آتا۔ دونوں ہمجولی ساتھ کھیلتے

ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ سوسیلا دونوں لڑکوں کو گود میں بٹھاتی۔ اور پیار کرتی۔ گھنٹوں ٹکٹکی لگائے دونوں بچوں کو دیکھا کرتی۔ برجن بھی کبھی کبھی پرتاپ کے گھر جاتی۔ مصیبت کی ماری سُبا مائے دیکھکر اپنی مصیبت بھول جاتی۔ چھاتی سے لگا لیتی۔ اور اُسکی بھولی بھولی باتیں سُنکر اپنا غم غلط کرتی۔

ایک روز منشی سبھیون لال باہر سے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرتاپ اور برجن دونوں دفتر میں کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ پرتاپ کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ اور برجن دھیان لگائے سُن رہی ہے۔ دونوں نے جوں ہی منشی جی کو دیکھا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ برجن تو دوڑ کر باپ کے گود میں جا بیٹھی۔ اور پرتاپ سر نیچا کرکے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ کیسا ذی شعور لڑکا تھا۔ سن ابھی آٹھ سال سے زیادہ نہ تھا۔ مگر بشرے سے آنے والی عظمت جھلک رہی تھی۔ روشن اور مردانہ چہرہ۔ پاک وصاف ہاتھ پاؤں۔ پتلے پتلے سُرخ ہونٹ۔ تیز چلتی ہوئی نگاہیں کالے کالے بھونرے کی طرح بال۔ اُسپر کپڑے صاف سُتھرے۔ منشی جی نے کہا "یہاں آؤ پرتاپ" پرتاپ آہستہ آہستہ کچھ ہچکچاتا۔ کچھ لجاتا قریب آیا۔ منشی جی نے پدرانہ محبت سے گود میں بٹھا لیا اور پوچھا "تم ابھی کونسی کتاب پڑھ رہے تھے؟"

پرتاپ بولنے ہی کو تھا کہ برجن بول اُٹھی۔ "بابا بڑی اچھی اچھی کہانیاں تھیں۔ کیوں بابا کیا پہلے چڑیاں بھی ہماری طرح باتیں کرتی تھیں"

منشی جی مُسکرا کر بولے "ہاں۔ وہ خوب بولتی تھیں"

ابھی اُنکے مُنہ سے پوری بات بھی نہ نکلنے پائی تھی کہ پرتاپ۔ جسکا شرمیلا پن اب دور ہو چلا تھا بول اُٹھا "نہیں برجن۔ تمھیں جھٹلاتے ہیں۔ یہہ کہانیاں بنائی ہوئی ہیں"

منشی جی اس بیباکانہ تردید پر خوب ہنسے۔

اب تو پرتاپ بلبل کی طرح چہکنے لگا۔ اسکول اتنا بڑا ہے کہ شہر بھر کے لوگ اُس میں بیٹھ جائیں۔ دیواریں اتنی اونچی ہیں جیسے تاڑ۔ بلدیو پرشاد نے جو گیند میں ہٹ لگائی تو وہ آسمان میں چلا گیا۔ بڑے ماسٹر صاحب کی میز پر ہری ہری بانات بچھی ہوئی ہے۔ اُس پر پھولوں سے بھرے گلاس رکھے رہتے ہیں۔ گنگا جی کا پانی نیلا ہے۔ ایسی زور سے بہتا ہے کہ پہاڑ بھی ہو تو بہہ جائے۔ وہاں ایک سادھو بابا ہیں۔ ریل دوڑتی ہے سن سن۔ اُسکا انجن بولتا ہے بھک بھک۔ انجن میں بھاپ ہوتی ہے۔ اُسی کے زور سے گاڑی چلتی ہے۔ گاڑی کے ساتھ ساتھ درخت بھی دوڑتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کی کتنی باتیں پرتاپ نے اپنی بھولی زبان میں بیان کیں۔ برجن تصویر کی طرح خاموش بیٹھی ہوئی سن رہی تھی۔ ریل پر وہ بھی دو تین بار سوار ہوئی تھی۔ مگر اُسے آجتک یہہ نہ معلوم ہوا کہ اُسے کس نے بنایا۔ اور وہ کیونکر چلتی ہے۔ دو تین بار اُسنے اپنے گرو جی سے یہہ سوال کیا تھا۔ مگر انھوں نے یہی کہکر ٹالدیا کہ بچّا ایشور کی مہما اپرم پار ہے۔ برجن نے بھی سمجھ رکھا تھا کہ ایشور کی مہما کوئی بڑا بھاری اور طاقتور گھوڑا ہوگا۔ جو اتنی گاڑیوں کو سن سن کھینچے لئے جاتا ہوگا۔ جب پرتاپ خاموش ہوا تو برجن نے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈالکر کہا" بابا ہم بھی پرتاپ کی کتاب پڑھیں گے"!

منشی۔ بیٹی تم تو سنسکرت پڑھتی ہو۔ یہہ تو بھاشا ہے"!

برجن۔ تو میں بھی بھاشا ہی پڑھونگی۔ اس میں کیسی اچھی اچھی کہانیاں ہیں۔ میری کتاب میں تو ایک کہانی بھی نہیں۔ کیوں بابا پڑھنا کسے کہتے ہیں"!

منشی جی بغلیں جھانکنے لگے۔ اِنھوں نے آجتک خود کبھی غور نہیں کیا تھا کہ پڑھنا کیا چیز ہے۔ ابھی وہ سر ہی کھجلا رہے تھے کہ پرتاپ بول اُٹھا۔ مجھے تمنے پڑھتے دیکھا

اُسی کو پڑھنا کہتے ہیں"۔

برجن۔ کیا میں نہیں پڑھتی۔ میرے پڑھنے کو پڑھنا نہیں کہتے؟"

برجن سدھانت کومدی پڑھ رہی تھی۔ پرتاپ نے کہا "تم طوطے کی طرح رٹتی ہو"۔

چوتھی فصل

رشتۂ اتحاد مضبوط ہوتا ہے
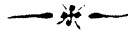
کچھ عرصہ سے سُباما نے گنجایش نہ دیکھکر مہراجن۔ کہار اور دو مہریوں کو جواب دیدیا تھا۔ کیونکہ اب نہ تو اُنکی کوئی ضرورت تھی۔ اور نہ اُنکا خرچ سنبھالے سنبھلتا تھا۔ صرف ایک بڑھیا مہری باقی رہ گئی تھی۔ اوپر کا کام کاج وہ کرتی۔ اور کھانا سُباما خود اپنے ہاتھ سے پکا لیتی۔ مگر بیچاری ایسی سخت محنت کی عادی تو تھی نہیں۔ چند ہی دنوں میں اُسے تھکن کے سبب سے رات کو حرارت رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہہ نوبت پہونچی کہ جب دیکھئے حرارت موجود۔ جسم پُھنکا جاتا ہے۔ نہ کھانے کی طرف رغبت ہے نہ پینے کی طرف۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ مگر وہ ہے کہ روز معمول کے موافق کام کئے جاتی ہے۔ دوا دارو کی بھی کوئی فکر نہیں۔ اور نہ کسی سے اسکا ذکر کرتی ہے۔ جب تک پرتاپ گھر پر رہتا ہے تب تک وہ چہرے کو ذرا بھی مدھم نہیں ہونے دیتی۔ مگر جوں ہی وہ مدرسہ چلا جاتا ہے۔ لحاف اوڑھکر پڑ رہتی ہے۔ اور دن بھر پڑے پڑے کراہا کرتی ہے۔

پرتاپ سمجھدار لڑکا تھا۔ ماں کی حالت روز بروز خراب ہوتے دیکھکر تاڑ گیا کہ یہہ بیمار ہے

ایک دن اسکول سے لوٹا تو سیدھا اپنے گھر گیا۔بیٹے کو دیکھتے ہی سُبا ماں نے اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کی۔مگر مارے ضعف کے چکر آگیا۔اور ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔پرتاپ نے اُسے سنبھالا۔اور اُس کی طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھکر بولا "اماں تم آج کل بیمار ہو گیا۔اتنی دُبلی کیوں ہو گئی ہو۔ دیکھو تمہارا جسم کتنا گرم ہے۔ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔"

سُبا ماں نے ہنسنے کی کوشش کی۔اپنی بیماری کا اظہار کر کے بیٹے کو کیسے تکلیف دے ماں تا پاک اور بیغرض محبت کا انتہائی درجہ ہے۔آواز کو ہلکا بنا کر بولی "نہیں بیٹا۔بیمار تو نہیں ہوں۔ آج ذرا حرارت ہو آئی تھی۔شام تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔الماری میں حلوا رکھا ہوا ہے۔نکال لو۔ نہیں تم آؤ بیٹھو۔میں ہی نکالے دیتی ہوں۔"

پرتاپ۔"اماں تم مجھ سے بہانہ کرتی ہو۔تم ضرور بیمار ہو۔ایک دن میں کوئی اتنا دُبلا نہیں ہو جاتا۔"

سُبا ماں۔(ہنسکر) "کیا تمہارے دیکھنے میں میں دُبلی ہو گئی ہوں۔مجھے تو نہیں معلوم ہوتا۔"

پرتاپ۔"میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں جاتا ہوں۔"

سُبا ماں۔(پرتاپ کا ہاتھ پکڑ کر) "تم کیا جانو وہ کہاں رہتے ہیں۔"

پرتاپ۔"پوچھتے پوچھتے چلا جاؤنگا۔"

سُبا ماں کچھ اور کہا چاہتی تھی کہ اُسے پھر چکر آیا۔آنکھیں پتھرا گئیں۔پرتاپ اُسکی یہہ حالت دیکھتے ہی سہم گیا۔اور کچھ تو نہ ہو سکا۔دوڑا ہوا برجن کے دروازہ پر آیا۔اور کھڑا ہو کر رونے لگا۔

ہر روز وہ اسوقت تک برجن کے گھر پہونچ جاتا تھا۔آج جو دیر ہوئی تو وہ گھبرائی ہوئی ادھر اُدھر پھر رہی تھی یکایک جو دروازہ پر جھانکنے آئی تو پرتاپ کو دونوں ہاتھوں سے مُنھہ چھپائے دیکھا۔پہلے تو سمجھی کہ اسنے دلگی سے مُنہ چھپالیا ہے۔مگر جب اُسکے ہاتھ ہٹائے تو آنسو نظر آئے۔چونک کر بولی "للو کیوں روتے ہو۔بتادو۔

پرتاپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ اور سسکنے لگا۔

برجن "نہ بتاؤ گے۔ کیا چچی نے کچھ کہا ہے۔ جاؤ تم چپ نہیں ہوتے"

پرتاپ نے کہا "نہیں برجن۔ اماں بہت بیمار ہیں"

یہ سنتے ہی برج رانی دوڑی۔ اور دم زدن میں سُباما کے سرھانے آکھڑی ہوگئی۔ دیکھا تو وہ بے حس و حرکت پڑی ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ اور سانس زور زور سے چل رہی ہے۔ ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی "چچی کیسا جی ہے۔ آنکھیں کھولو کیسا جی ہے"

مگر چچی نے آنکھیں نہ کھولیں تب اُسنے طاق پر سے تیل اُتار لیا۔ اور سُباما کے سر میں ڈالکر آہستہ آہستہ ملنے لگی۔ اُس غریب کے سر میں مہینوں سے تیل پڑنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ٹھنڈک پہونچیں تو آنکھیں کھُل گئیں۔

برجن "چچی کیسا جی ہے؟ کہیں درد تو نہیں"

سُباما "نہیں بیٹی درد کہیں نہیں ہے۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ بھیّا کہاں ہے؟"

برجن "وہ تو میرے گھر ہیں۔ بہت رو رہے تھے"

سُباما "تم جاؤ اُسکے ساتھ کھیلو۔ اب میں بالکل اچھی ہوں"

برجن "میں ابھی نہ جاؤنگی۔ جب تم اچھی ہو جاؤ گی تب جاؤنگی"

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سوسیلا بھی داخل ہوئی۔ اُسے سباما سے ملنے کا تو بہت دنوں سے اشتیاق تھا۔ مگر کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ اسوقت عیادت کے بہانے سے آپہونچی۔ برجن نے اپنی ماں کو دیکھا تو اُچھل پڑی۔ اور تالی بجا بجا کر کہنے لگی۔ اماں آئیں۔ اماں آئیں"

دونوں عورتوں میں شکوہ شکایت ہونے لگے۔ باتوں باتوں میں چراغ جل گیا۔

کسی کو خیال بھی نہ گذرا کہ پرتاپ کہاں ہے۔ ذرا دیر تک تو وہ دروازے پر کھڑا روتا رہا۔ پھر یکایک آنکھیں پونچھکر ڈاکٹر چلو کے مکان کی طرف لپکتا ہوا چلا۔ ڈاکٹر صاحب منشی سالگرام کے دوستوں میں تھے۔ اور جب کبھی ضرورت ہوتی وہی بلائے جاتے۔ پرتاپ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ برنا ندی کے کنارے لال بنگلے میں رہتے ہیں۔ اُسے ابتک اپنے محلہ سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مگر اسوقت فرزندانہ جوش کی بیقراری میں اُسے ان رکاوٹوں کا مطلق دھیان نہ آیا گھر سے نکلکر بازار میں آیا۔ اور ایک یکّہ والے سے بولا۔ لال بنگلے چلوگے؟ لال بنگلہ مشہور جگہ تھی۔ یکّہ والا تیار ہوگیا۔ اور آٹھ بجتے بجتے ڈاکٹر صاحب کی فٹن سُباما کے دروازے پر آ پہونچی۔ یہاں اِسوقت چاروں طرف اُسکی تلاش ہورہی تھی۔ کہ دفعتاً وہ متانت کے ساتھ قدم بڑھاتا اندر گیا اور بولا "پردہ کرو۔ ڈاکٹر صاحب آتے ہیں"

سُباما اور سوسیلا دونوں چونک پڑیں۔ سمجھ گئیں کہ یہہ ڈاکٹر صاحب کو بلانے چلا گیا تھا۔ سُباما نے فرط محبت سے اُسے گود میں بٹھالیا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھنے لگی کیا اکیلے چلے گئے تھے۔ تمھیں راستہ کیسے معلوم ہوا۔ ڈر نہیں لگا۔ ہم سے بتلایا بھی نہیں۔ یونہی چلے گئے۔ تم کھو جاتے تو میں کیا کرتی۔ ایسا لال کہاں پاتی۔ یہہ کہہ کر اُسنے بیٹے کو بار بار چوما۔ پرتاپ ایسا خوش تھا گویا امتحان میں پاس ہوگیا ہے۔ ذرا دیر میں پردہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب آئے سُباما کی نبض دیکھی۔ تشفی دی۔ پرتاپ کو گود میں بٹھاکر باتیں کرتے رہے۔ دوا ساتھ لیتے آئے تھے۔ اُسے پلانے کی تاکید کرکے نو بجے اپنے بنگلے کو واپس گئے۔ مگر چونکہ بخار پُرانا تھا۔ پورے مہینہ بھر سُباما کو کڑوی کڑوی دوائیں پینی پڑیں۔ ڈاکٹر صاحب دونوں وقت آتے۔ اور ایسی توجہ اور شفقت سے پیش آتے گویا سُباما اُنکی بہن ہے۔ ایک دفعہ سُباما نے ڈرتے ڈرتے فیس کے روپئے ایک طشتری میں رکھکر پیش کئے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اُنھیں ہاتھ

تک نہ لگایا۔ صرف اتنا کہا" اسے میری طرف سے پرتاپ کو دیدیجئے گا۔ وہ پاؤں پاؤں مدرسے جاتا ہے۔ یہ گاڑی مول لے لیگا۔"

برجن اور اُسکی ماں دونوں آٹھوں پہر اُسکی تیمارداری کے لئے حاضر رہتیں۔ ماں چاہے تساہلی بھی کرجائے۔ مگر برجن وہاں سے ایک دم کو بھی نہ ہٹتی۔ دوا پلاتی۔ پانی دیتی۔ جب سُباما کی طبیعت ہلکی ہوتی تو اُس سے بھولی بھولی باتیں کرکے اُسکا دل بہلاتی کھیلنا کودنا سب چھوٹ گیا۔ جب سُباما بہت اصرار کرتی تو ذرا دیر کے لئے پرتاپ کے ساتھ باغچہ میں کھیلنے چلی جاتی۔ چراغ جلتے ہی پھر آبیٹھتی۔ اور جب تک مارے نیند کے جھک جھک نہ پڑتی وہاں سے اُٹھنے کا نام نہ لیتی۔ بلکہ اکثر وہیں سوجاتی۔ رات کو آدمی گود میں اُٹھا کر گھر لیجاتا نہیں معلوم اُسے ایسی کیا دُھن سوار ہوگئی تھی۔

ایک دن برج رانی سُباما کے سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ نہ جانے کس خیال میں غرق تھی۔ آنکھیں دیوار کی طرف لگی ہوئی تھیں اور جسطرح درختوں پر چاندنی لہراتی ہے اسی طرح ہلکی ہلکی مُسکراہٹ اُسکے لبوں پر لہرا رہی تھی۔ اُسے مطلق خبر نہ تھی کہ چچی میری طرف تاک رہی ہیں۔ دفعتاً اُسکے ہاتھ سے پنکھا چھوٹ پڑی۔ جوں ہی وہ اُسے اُٹھانے کے لئے جُھکی کہ سُباما نے اُسے گلے لگالیا اور چمکار کر پوچھا" برجن سچ بتلاؤ۔ تم ابھی کیا سوچ رہی تھیں؟"

برجن نے سر جُھکالیا اور کچھ شرما کر بولی "کچھ نہیں تم سے نہ بتلاونگی۔"

سُباما۔ (چمکار کر) "میری اچھی برجن۔ بتادے کیا سوچتی تھی؟"

برجن ۔ (شرماتے ہوئے) "سوچتی تھی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ جاؤ ہنسو مت ۔ ۔ ۔ ۔ نہ بتلاونگی"

سُباما" اچھا اے نہ ہنسونگی۔ بتاؤ۔ لے یہ تو اب اچھا نہیں لگتا۔ پھر میں آنکھ بند کرلونگی۔"

برجن" کسی سے کہوگی تو نہیں۔"

سُبامانے نہیں کسی سے نہ کہونگی۔

برجن۔ سوچتی تھی کہ جب پرتاپ سے میرا بیاہ ہو جائیگا تو خوب مزے سے رہونگی۔"

سُبامانے اُسے سینہ سے چمٹالیا اور بولی "پیاری وہ تو تیرا بھائی ہے۔"

برجن "ہاں بھائی ہے۔ میں جان گئی تم مجھے بہو نہ بناؤ گی۔"

سُباما۔ آج للّو کو آنے دو۔ اس سے پوچھوں دیکھوں کیا کہتا ہے۔"

برجن "نہیں نہیں اُن سے نہ کہنا۔ میں تمہارے پیروں پڑوں۔"

سُباما "میں تو کہدونگی۔"

برجن "تمہیں ہماری قسم اُن سے نہ کہنا۔"

پانچویں فصل

شریفانہ زندگی کے نظارے

دن جاتے دیر نہیں لگتی۔ دو سال گذر گئے۔ پنڈت موٹے رام روز اعلی الصبّاح آتے۔ اور سد ھانت کومدی پڑھاتے۔ حالانکہ اب اُنکا آنا محض رسماً تھا۔ کیونکہ اس کتاب کے پڑھنے میں برجن کا دل مطلق نہ لگتا تھا۔ ایک روز منشی جی انجینیر کے دفتر سے آئے۔ کمرہ میں بیٹھے تھے۔ نوکر جوتے کا فیتہ کھول رہا تھا کہ رِدھیا مہری مُسکراتی ہوئی گھر میں سے نکلی۔ اور اُنکے ہاتھ میں ایک سربمہر لفافہ رکھدیا۔ اور مُنہ پھیر کر ہنسنے لگی۔ سرنامہ پر لکھا ہوا تھا بخدمت جناب بابا صاحب برسد۔"

منشی ۔" ارے تو کسکا لفافہ لے آئی۔ یہہ میرا نہیں ہے"

مہری ۔" سرکار ہے کا تو ہے۔ کھولیں تو آپ"

منشی ۔" کسنے دیا۔ کوئی آدمی باہر سے آیا تھا"

مہری ۔ (مسکراتی ہوئی) آپ کھولینگے تو پتہ لگجائیگا"

منشی جی نے حیرت میں آکر لفافہ کھولا تو یہہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

باباکو برجن کا پرنام اور پالاگن پہونچے۔ یہاں آپ کی کرپا سے کشل منگل ہے۔ آپ کا کشل منگل شری وشوناتھ جی سے سدا منایا کرتی ہوں۔ میں نے پرتاپ سے بھاشا سیکھ لی۔ وہ اسکول سے شام کو آکر مجھے روز پڑھاتے ہیں۔ اور اب آپ ہمارے لئے اچھی اچھی کتابیں لائیے۔ کیونکہ پڑھنا ہی زندگانی کا سُکھ ہے۔ اور ودیا انمول چیز ہے۔ وید پُران میں اسکا مہاتم لکھا ہوا ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ ودیا دھن دل و جان سے جمع کرے۔ ودیا سے سب دُکھ دور ہو جاتے ہیں۔ میں نے کل شام کو بیتال پچیسی کی کہانی چچی کو سُنائی تھی۔ انھوں نے مجھے ایک خُبصورت گڑیا انام دی ہے۔ بہت اچھی ہے۔ میں اُسکا بیاہ کرونگی تب آپ سے روپیہ لونگی۔ میں اب پنڈت جی سے نہ پڑھونگی۔ اماں نہیں جانتیں کہ میں بھاشا پڑھتی ہوں۔

آپکی پیاری برجن

القاب دیکھتے ہی منشی جی کے کلیجہ میں گدگدی محسوس ہونے لگی۔ پھر تو ایک ہی نظر میں سارا خط پڑھ ڈالا۔ مارے خوشی کے ننگے پاؤں ہنستے ہوئے اندر دوڑے۔ پرتاپ کو گود میں اُٹھالیا۔ اور دونوں لڑکوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے سوسیلا کے پاس گئے اور خط دکھا کر کہا بُوجھو کسکا خط ہے؟"

سوسیلا۔ "لاؤ ہاتھ میں دو۔ دیکھوں"

منشی جی۔ "نہیں وہیں سے بیٹھے بیٹھے بتاؤ۔ جلدی"

سوسیلا۔ "بوجھ جاؤں تو کیا دوگے"

منشی جی۔ "پچاس روپئے دودھ کے دھوئے ہوئے۔

سوسیلا۔ "پہلے روپیہ نکال کر رکھدو۔ نہیں تو مکر جاؤگے"

منشی جی۔ "مکرنے والے کو کچھ کہتا ہوں۔ ابھی روپیہ لو۔ ایسا کوئی ٹٹ پونجیا سمجھ لیا ہے"

یہہ کہکر دس روپیہ کا ایک نوٹ جیب سے نکالکر دکھایا۔

سوسیلا۔ "کتنے کا نوٹ ہے"

منشی جی۔ "پچاس روپیہ کا۔ ہاتھ میں لیکر دیکھ لو"

سوسیلا۔ "لے لونگی۔ کہے دیتی ہوں"

منشی جی۔ "ہاں ہاں لے لینا۔ پہلے بتاؤ تو سہی"

سوسیلا۔ "الّو کا ہے۔ لائیے نوٹ۔ اب میں نہ مانونگی"

یہہ کہکر وہ اُٹھی اور منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا"

منشی جی۔ "ایسی کیا رہزنی ہے۔ نوٹ چھینے لیتی ہو"

سوسیلا۔ "زبان نہیں دی تھی۔ ابھی سے مکرنے لگے"

منشی جی۔ "تُمنے بوجھا بھی۔ صاف دھوکا کھا گئیں"

سوسیلا۔ "چلو چلو بہانہ کرتے ہو۔ نوٹ ہضم کرنے کی نیت ہے۔ کیوں للّو تمہارا ہی خط ہے نہ؟

پرتاپ نے نیچی نگاہوں سے منشی جی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا میں نے کہاں لکھا۔

منشی جی۔ "شرماؤ شرماؤ۔

سوسیلا۔ "وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اسی کا خط ہے۔ تم لوگ آپس میں گٹھ کر آئے ہو۔"

پرتاپ۔ "میرا خط نہیں ہے۔ سچ۔ برجن نے لکھا ہے۔"

سوسیلا کے منہ سے بے اختیار نکلا "برجن کا" اور اُسنے دوڑ کر شوہر کے ہاتھ سے خط چھین لیا۔ اور بھوچک ہوکر اُسے دیکھنے لگی۔ مگر اب بھی یقین نہ آیا۔ برجن سے پوچھا کیوں بیٹی یہ تمہارا لکھا ہے۔ برجن نے سر جھکا کر کہا "ہاں" یہ سنتے ہی ماں نے اُسے گلے لگالیا۔ اب آج سے برجن کا یہہ حال ہوگیا کہ جب دیکھئے قلمدان لئے بیٹھی ہے۔ اور کاغذ سیاہ کر رہی ہے گھر کے کام دھندے سے تو اسے پہلے ہی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ لکھنے کا آنا سونے پہ سہاگا ہوگیا ماں اُسکی مصروفیت دیکھ دیکھکر خوش ہوتی۔ باپ پھولا نہ سماتا۔ نت نئی کتابیں لاتا کہ برجن ہوشیار ہوجائیگی تو پڑھیگی۔ اگر وہ کبھی اپنا پیر آپ دھولیتی یا کھانا کھا کر آپ ہی ہاتھ دھونے لگتی تو ماں مہریوں پر برس پڑتی۔ آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ چربی چھا گئی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے پانی انڈیل رہی ہے۔ اور تم کھڑی منہ تاکتی ہو۔

اسی طرح دن گذرتے چلے گئے۔ برجن کا بارھواں سال پورا ہوا۔ مگر ابھی تک اُسے چاول اُبالنے تک کا شعور نہ تھا۔ چولہے کے سامنے بیٹھنے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔ سُبا ما نے ایک دن اُسکی ماں سے کہا۔ "بہن برجن سیانی ہوئی۔ کیا کچھ گن ڈھنگ نہ سکھاؤ گی۔"

سوسیلا۔ "کیا کہوں۔ جی تو چاہتا ہے کہ لگا لگاؤں۔ مگر کچھ سوچکر رہ جاتی ہوں۔"

سُبا ما۔ "کیا سوچکر رہ جاتی ہو۔"

سوسیلا۔ "کچھ نہیں۔ آلکس آجاتا ہے۔"

سُبا ما۔ "تو یہہ کام میرے سپرد کردو۔ کھانا پکانا عورتوں کے لئے سب سے ضروری بات ہے۔"

سوسیلا۔ "ابھی چولھے کے سامنے اُس سے بیٹھا نہ جائیگا۔"

سُبا ما۔ "کام کرنے ہی سے آتا ہے۔"

سوسیلا۔ (جھینپتے ہوئے) پھول سے گال کھلا جائیں گے۔"

سُبا ما۔ (ہنسکر) "بلا پھول کے مرجھائے کہیں پھل لگا ہے۔"

دوسرے دن سے برجن کھانا پکانے لگی۔ پہلے دس پانچ دن اُسے چولھے کے سامنے بیٹھنے میں سخت تکلیف ہوئی۔ آگ نہ جلتی۔ پھونکنے لگتی تو آنکھوں سے پانی بہتا۔ وہ بوٹی کی طرح لال ہو جاتیں۔ چنگاریوں سے کئی ریشمی ساڑیاں ستیاناس ہو گئیں۔ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ مگر رفتہ رفتہ یہہ سب مصیبتیں رفع ہو گئیں سُبا ما ایسی نیک مزاج عورت تھی کہ کبھی ناراض نہ ہوتی۔ ہمیشہ چمکار کر اُسے کام میں لگائے رہتی۔

ابھی برجن کو کھانا پکاتے دو ماہ سے زیادہ نہ گذرے ہونگے کہ ایک دن اسنے پرتاپ سے کہا "للو مجھے کھانا پکانا آگیا۔"

پرتاپ۔ "سچ!"

برجن۔ "کل چچی نے میرا پکایا کھانا کھایا تھا۔ بہت خوش ہوئیں۔"

پرتاپ۔ "تو بھی ایک دن میری بھی دعوت کرو۔"

برجن۔ (خوش ہوکر) "اچھا کل۔"

دوسرے دن نو بجے برجن نے پرتاپ کو کھانے کے لئے بُلایا۔ اُسنے جا کر دیکھا تو چوکا لگا ہوا ہے۔ تازی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آرہی ہے۔ آسن صفائی سے بچھا ہوا ہے۔ ایک تھالی میں چاول اور چپاتیاں ہیں۔ دال اور ترکاریاں الگ الگ کٹوروں میں رکھی ہوئی ہیں۔ لوٹا اور گلاس پانی سے بھرا ہوا موجود ہے۔ یہہ صفائی اور سلیقہ دیکھکر پرتاپ

کسی انگریز کی ملاقات کو نہ گئے۔

بابو شیاما چرن اگرچہ کسی معنی میں حریص شہرت نہ تھے۔ مگر اپنے نام نیک کو بدنامی کی ہوا سے بچاتے رہتے تھے۔ خاندانی اعزاز اور وجاہت پر بھی انھیں کسی قدر فخر تھا۔ اپنی وضع کے وہ بڑے رنگین مزاج آدمی تھے۔ انکی باتیں ظرافت سے بھری ہوتی تھیں۔ شام کیوقت جب وہ چند منتخب احباب کے ساتھ صحن میں بیٹھتے تو انکے قہقہہ کی گونجتی ہوئی آواز باغچہ سے سنائی دیتی تھی۔ نوکروں چاکروں سے وہ بہت بے تکلفی کا برتاؤ رکھتے۔ یہانتک کہ انکے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھنے سے بھی عار نہ تھا۔ مگر انکا رعب کچھ ایسا چھایا ہوا تھا کہ کسی کو انکی ان کمزوریوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ وضع قطع سادہ رکھتے۔ کوٹ پتلون سے انھیں نفرت تھی۔ بٹن دار اونچی اچکن۔ اسپر ایک ریشمی کام کی عبا۔ سیاہ شملہ۔ ڈھیلہ پاجامہ۔ اور دلی کی ساخت کا نوکدار جوتا انکی خاص وضع تھی۔ اور انکے دہرے بدن سرخ و سفید چہرہ اور میانہ قد پر جسقدر یہہ لباس زیب دیتا تھا۔ اُتنا کوٹ پتلون سے ممکن نہ تھا۔

مگر ڈپٹی شیاما چرن کا رعب چاہے سارے شہر میں چھایا ہوا ہو۔ خود اپنے گھر کی چہار دیواری کے اندر انکی ایک نہ چلتی تھی۔ یہاں مسز شیاما چرن کی عملداری تھی۔ اور وہ اپنے ممالک محروسہ میں مطلق العنانی کے ساتھ راج کرتی تھیں۔ نوکروں کا تقرر۔ انکی برخاستگی۔ انکی سزا۔ خانگی ضروریات۔ لین دین۔ غرض ان کل امور میں اُنھیں سیاہ و سفید کا اختیار تھا۔ کئی برس گذرے ڈپٹی صاحب نے پریموتی کی مرضی کے خلاف ایک مہراجن نوکر رکھ لی تھی۔ مہراجن ذرا رنگیلی تھی۔ پریموتی اپنے شوہر کی اس مداخلت بیجا پر ایسی برہم ہوئی کہ ہفتوں تک کوپ بھون میں بیٹھی رہی۔ آخر زچ ہو کر ڈپٹی صاحب نے مہراجن کو رخصت کر دیا۔ تب

اُنھیں پھر خانگی معاملات میں رخنہ ڈالنے کی کبھی ہمت نہ پڑی حالانکہ بیچارے بہت متقی اور پاک نفس آدمی تھے۔ اور اب سن بھی چالیس سے متجاوز ہوگیا تھا مگر پریموتی کے دل میں ابھی تک اُنکی جانب سے بدگمانی بنی ہوئی تھی۔ اُسکا مزاج خلقۃً تحمل نہ واقع ہوا تھا۔ اسکے ساتھ ہی اُسے جھوٹی شیخی اور بڑے بول سے سخت نفرت تھی۔ جب کبھی وہ شہر میں کسی کے یہاں تقریب میں شریک ہونے کے لئے جاتی تو گویا یہہ مسلمہ بات تھی کہ وہاں بدمزگی ضرور پیدا ہوگی۔ عورتوں کو بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے دیکھکر اُس سے ضبط نہوتا۔ برس پڑتی۔ امرِ حق کے اظہار سے وہ کبھی نہ چوکتی۔ چاہے اسکی پاداش میں اُسے تُو تُو میں میں بھی کیوں نکرنا پڑے۔ اور طعنوں کے تیر چھوڑنے میں تو اسے خاص ملکہ تھا۔

منشی جی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑا لڑکا رادھا چرن پچھلے سال ڈگری حاصل کرکے اسوقت رُڑکی کالج میں پڑھتا تھا۔ اُسکی شادی فتحپور سیکری کے ایک رئیس کے یہاں ہوئی تھی۔ منجھلی لڑکی کا نام سیوتی تھا۔ اُسکی شادی بھی الہ آباد کے ایک متمول گھرانے میں ہوگئی تھی۔ چھوٹا لڑکا کملا چرن ابھی تک بن بیاہا تھا۔ پریموتی نے بچپنے ہی سے لاڈ پیار کرکے اُسے ایسا بیباک اور بدشوق بنادیا تھا کہ اُسکی طبیعت پڑھنے لکھنے کی طرف ذرا بھی زمائل ہوتی۔ پندرہ برس کا ہوچکا تھا۔ مگر ابھی تک سیدھا سا خط لکھنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ میاں جی بیٹھے۔ اُنھیں اپنے مہینہ بھر کے اندر نکالکر دم لیا۔ تب مدرسے میں نام لکھایا گیا۔ وہاں جاتے ہی اُسے بخار چڑھ آتا۔ اور دردِ سر شروع ہوجاتا۔ اسلئے وہاں سے بھی اُٹھالیا گیا۔ تب ایک ماسٹر صاحب اتالیقی پر مامور ہوئے۔ مگر اُنکے تین مہینہ کی دوران ملازمت میں کملا چرن نے مشکل سے تین سبق پڑھے ہونگے آخر ماسٹر صاحب بھی رخصت ہوئے۔ تب ڈپٹی صاحب نے خود پڑھانے کی ٹھانی۔ مگر ایک ہی ہفتہ میں انھیں کئی بار کملا کا

سر ہلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گواہوں کے بیانات۔ اور وکلاء کی جرحوں کی تہہ تک پہونچنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کسی بدشوق لڑکے کے دل میں تعلیم کی رغبت پیدا کرنا۔ پریموتی نے اس مار دھاڑ پر ایسی داد فریاد مچائی کہ آخر ڈپٹی صاحب نے بھی جھلّا کر چھوڑ دیا۔ کملا کچھ ایسا قبول صورت۔ ایسا نازک بدن اور شیریں زبان تھا کہ ماں اُسے سب لڑکوں سے زیادہ چاہتی۔ اُسکی ناز برداریوں نے کملا کو کنکوے بازی۔ کبوتر بازی۔ اور اسی قبیل کے دوسرے مشاغل کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ صبح ہوئی اور کبوتر اُڑائے جانے لگے۔ بٹیروں کے جوڑ چھوٹنے لگے۔ شام ہوئی اور کنکوے کے لمبے لمبے پیچ ہونے لگے۔ کچھ دنوں سے جوئے کا چسکا بھی پڑ چلا تھا۔ آئینہ کنگھی اور عطر تیل میں تو گویا اُسکی جان بستی تھی۔ سن ابھی کچھ نہ تھا۔ مگر شہدوں کے فیض صحبت سے نظربازی میں بھی شہرۂ آفاق تھے۔

پریموتی ایک دن سُبھاما سے ملنے گئی ہوئی تھی سو وہاں اُسنے برج رانی کو دیکھا۔ اور اُسی دن سے اُسکا جی للچا یا ہوا تھا کہ اگر یہہ بہو بنکر میرے گھر میں آئے تو گھر کے بھاگ جاگ اُٹھیں۔ ایک رازداں عورت کے ذریعہ سے سوسیلا پر اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ برجن کو تیرھواں سال شروع ہو چکا تھا۔ میاں بیوی میں شادی کے متعلق صلاح و مشورہ ہو رہا تھا۔ پریموتی کا عندیہ پا کر دونوں پھولے نہ سمائے۔ ایک تو جان پہچان کے آدمی۔ پھر عالی خاندان۔ لڑکا ذہین اور تعلیم یافتہ۔ موروثی جائداد کثیر۔ اگر ان سے ناتا ہو جائے تو کیا پوچھنا۔ چٹ پٹ باقاعدہ طور پر پیغام کہلا بھیجا۔ اسطرح اتفاقات نے آج اُس زہریلے درخت کا بیج بویا جسنے تین ہی برس میں خاندان کا خاندان تباہ کر دیا۔ مستقبل ہماری نگاہوں سے کیا پوشیدہ رہتا ہے۔

جوں ہی پیغام پہونچا پریموتی پھولی نہ سمائی۔ ساس نند اور بہو

بہو۔ "چندرا! کیوں اماں کیا آپ اسی سال بیاہ کرینگی؟"

پرمیوتی۔ "اور کیا۔ تمہارے لالہ جی کی ماننے کی دیر ہے۔"

بہو۔ "کچھ تلک جہیز بھی ٹھہرا؟"

پرمیوتی۔ "تلک جہیز ایسی لڑکیوں کے لئے نہیں ٹھہرایا جاتا۔ جب ترازو میں لڑکی لڑکے کے برابر نہیں ٹھہرتی تب جہیز کا پاسنگ بنا کر اُسے برابر کر دیتے ہیں۔ ہماری برج رانی کملا سے بہت بھاری ہے۔"

سیوتی۔ "کچھ دنوں گھر میں خوب چہل پہل رہیگی۔ بھابھی گیت گائیں گی۔ میں ڈھول بجاؤنگی کیوں بھابھی؟"

چندرا۔ مجھے ناچنا گانا نہیں آتا۔

چندرا کی آواز ذرا بھاری تھی۔ جب گاتی تو راگ میں بے سراپن آجاتا۔ اس لئے اسے گانے سے چڑھ تھی۔

سیوتی۔ "یہہ تو تم آپ ہی کہو۔ تمہارے گانے کی سنسار میں دھوم ہے۔"

چندرا جل گئی۔ تیکھی ہو کر بولی "جسے ناچ گا کر دوسرونکو لبھانا ہو وہ ناچنا گانا سیکھے۔"

سیوتی۔ تم تو ذرا سی دل لگی میں ناراض ہو جاتی ہو۔ ذرا وہی گیت گاؤ "تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو" اسوقت سننے کا بہت جی چاہتا ہے۔ مہینوں سے تمہارا گانا نہیں سنا۔"

چندرا۔ "تمھیں گاؤ۔ تمہارا گلا کوئلوں کا سا ہے۔"

سیوتی۔ "لے اب تمہاری یہی شرارت اچھی نہیں لگتی۔ میری بھابھی۔ ذرا گاؤ۔"

"میں اسوقت ہرگز نہ گاؤنگی۔ کیا مجھے کوئی ڈومنی مقرر کیا ہے۔"

تو بلا گیت سنے آج تمہارا پیچھا نہ چھوڑونگی۔"

سیوتی کی آواز نہایت دلکش اور سُریلی تھی۔ خط و خال بھی دلفریب تھے۔ گیہُنی رنگ۔ رسیلی آنکھیں۔ پیازی رنگ کی ساڑی اُسپر خوب کھل رہی تھی۔ آپ ہی آپ گنگنانے لگی۔

تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو۔۔۔۔۔ تم تو شیام۔۔

آپ تو شیام پیو دودھ کے کلھڑ! میری تو پانی پہ گھبر۔ پانی پر گھبر ہو۔

تم تو شیام

"دودھ کے کلھڑ" پر بے اختیار ہنس پڑی۔ پرمیوتی بھی مُسکرائی۔ مگر چندرا ہانسی ہو گئی۔ بولی "بلا ہنسی کی ہنسی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے"

سیوتی:۔ "آؤ ہم تم ملکر گائیں"

چندرا:۔ "کوئل اور چیل کا کیا ساتھ ؟"

سیوتی:۔ "غصہ تمہاری ناک پر رہتا ہے"

چندرا:۔ "تو ہمیں کیوں چھیڑتی ہو۔ ہمیں گانا نہیں آتا تو کوئی تم سے شکایت کرنے تو نہیں جاتا"

"کوئی" کا اشارہ رادھا چرن کی طرف تھا۔ چندرا میں چاہے اور کوئی گُن نہو۔ مگر شوہر کی خدمت دل و جان سے کرتی تھی۔ اُنکا ذرا سر دھمکا۔ اور اسکی جان نکلی۔ اُنکو گھر آنے میں ذرا دیر ہوئی۔ اور یہہ بیقرار ہونے لگی۔ جب سے وہ رُڑکی چلے گئے تب سے چندرا کا ہنسنا بولنا سب چھوٹ گیا تھا۔ اسکی خوشی اُنکے ساتھ چلی گئی تھی۔ انھیں باتوں نے رادھا چرن کو بیوی کا شیدا بنا دیا تھا۔ حُسن اور سلیقہ اور گُن۔ یہہ سب محبت کے مقابلے میں بہت ارزاں چیزیں ہیں محبت حُسن اور سلیقہ اور گُن کی سب خامیاں پوری کر دیتی ہے

سیوتی:۔ "شکایت کیوں کریگا۔ کوئی تو تم پہ دل و جان سے ریجھا ہوا ہے"

چندرا۔ "ادھر کئی دن سے خط نہیں آیا۔"

سیوتی۔ "تین چار دن ہوئے ہونگے۔"

چندرا۔ "تم سے تو ہاتھ پیر جوڑ کے ہار گئی۔ تم لکھتی ہی نہیں۔"

سیوتی۔ "اب وہی باتیں روز روز کون لکھے۔ کوئی نئی بات ہو تو لکھنے کا جی چاہے۔"

چندرا۔ "آج شادی کا حال لکھ دینا۔ لاؤں قلم دوات۔"

سیوتی۔ "مگر ایک شرط پر لکھونگی۔"

چندرا۔ "بتاؤ۔"

سیوتی۔ "تمھیں شام والا گیت گانا پڑیگا۔"

چندرا۔ "اچھا گا دونگی۔ ہنسنے ہی کا جی چاہتا ہے نہ۔ ہنس لینا۔"

سیوتی۔ "پہلے گا دو تو لکھوں۔"

چندرا۔ "نہ لکھو گی۔ پھر باتیں بنانے لگو گی۔"

سیوتی۔ "تمہاری قسم لکھ دونگی۔ گاؤ۔"

چندرا گانے لگی۔

تم تو شیام پیو دودھ کے کلھڑ + میری تو پانی پے گجر۔ پانی پے گجر ہو

تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو

آخری الفاظ کچھ اس بے سُرے پن سے نکلتے تھے کہ ہنسی کا ضبط کرنا محال تھا۔

سیوتی نے بہت روکا۔ مگر ہنسی نہ رُک سکی۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

چندرا نے دوسرا بند گایا۔

آپ تو شیام رکھو دو دو لُگَنیاں ڈُ لگا ساں) + میری تو آپی پے نجر۔ آپی پے بجر ہو۔ تم تو شیام

لُغیاں پر سیوتی ہنستے ہنستے لوٹ گئی - چندرا نے آبدیدہ ہوکر کہا "اب تو خوب ہنس چکیں - لاؤں قلم دوات؟"

سیوتی "نہیں نہیں ابھی ذرا ہنس لینے دو۔"

سیوتی ہنس ہی رہی تھی کہ بابو کملا چرن باہر سے تشریف لائے - پندرہ سولہ برس کا سن تھا - گورا گورا گندمی رنگ - چھریرا بدن - خوشرو - چہرہ زرد - پُر تکلف پوشاک زیب تن کئے - عطر میں بسے - آنکھوں میں سُرمہ - لبوں پر مُسکراہٹ اور ہاتھ میں بُلبُل - آکر چارپائی پر بیٹھ گئے - سیوتی بولی - کملو - منہ میٹھا کراؤ تو تمھیں خوشخبری سنائیں - سنتے ہی پھڑک اٹھو۔"

کملا "منہ تو تمہارا آج ضرور ہی میٹھا ہوگا - چاہے خوشخبری سناؤ یا نہ سناؤ - آج اس شیر نے وہ میدان مارا ہے کہ باید وشاید۔"

یہ کہکر کملا چرن نے بُلبل کو انگوٹھے پر بٹھالیا -

سیوتی "میری خبر سنتے ہی ناچنے لگو گے۔"

کملا "تو بہتر ہے آپ نہ سنائیے - میں تو آج یوں ہی ناچ رہا ہوں - اس شیر نے آج ناک رکھ لی۔ سارا شہر دنگ رہ گیا - نواب مُنّے خاں بہت دنوں سے ایجانب کی آنکھوں پر چڑھے ہوئے تھے - ایک مہینہ ہوتا ہے میں اُدھر سے نکلا تو آپ فرمانے لگے میاں کوئی پٹھا تیار ہو تو لاؤ دو دو چونچیں ہو جائیں - یہ کہکر آپنے اپنا پرانا بُلبل دکھایا - مینے عرض کیا بندہ نواز - ابھی تو نہیں - مگر ایک مہینہ میں انشا اللہ آپ سے ضرور ایک جوڑ ہوگی - اور بدبد کر - آج آغا شیر علی کے اکھاڑے میں بدان کی ٹھیری - پچاس پچاس روپیہ کی بازی تھی - لاکھوں آدمی جمع تھے - نواب صاحب کا بلبل جہاندیدہ یقین مانو سیوتی کمبخت کبوتر کے برابر تھا - مگر جسوقت یہہ پٹھا چلا ہے تو اسکی اُٹھی ہوئی گردن مستانہ چال اور گٹھیلے پن پر لوگ واہ واہ کرنے لگے - جاتے ہی

جاتے اپنے اُسکا ٹیٹو ا لیا مگر وہ بھی محض پھولا نہ تھا۔ سارے شہر کے بلبلوں کو سر کئے ہوئے۔ زور سے لات چلائی۔ اسنے خالی دی۔ اور پھر جھپٹ کر اُسکی چوٹی دبائی۔ اُس نے پھر چوٹ کی۔ یہہ نیچے آیا۔ چو طرفہ غل مچ گیا۔ مار لیا مار لیا۔ تب تو اینجانب کو بھی غصہ آیا۔ ٹوپٹے کر جو للکارتا ہوں تو یہہ اوپر اور وہ نیچے دبا ہوا۔ پھر تو اُسنے ہزار ہزار سر ٹپکا کہ اوپر آجائے۔ مگر اس شیر نے ایسے دابا کہ سر نہ اُٹھانے دیا۔ نواب صاحب خود موجود تھے بہت پیچھے چلائے۔ مگر کیا ہو سکتا ہے۔ اِسنے اُسے ایسا دبوچا تھا جیسے باز بڑی کو۔ آخر کمبخت بگٹٹ بھاگا۔ اِسنے پالی کے اُس سرے تک پیچھا کیا۔ مگر نہ پا سکا۔ لوگ حیرت سے دنگ رہ گئے۔ نواب صاحب کا تو چہرہ فق ہو گیا۔ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ روپیہ ہارنے کی تو انھیں کچھ پرواہ نہیں لاکھوں کی آمدنی ہے۔ مگر شہر میں جو اُنکی ڈھاک بندھی ہوئی تھی وہ جاتی رہی۔ روتے ہوئے گھر کو سدھارے سنتا ہوں یہاں سے جاتے ہی اپنے بُلبل کو زندہ دفن کر دیا۔"

یہہ کہکر کملا چرن نے جیب کھنکھنائی۔

سیوتی "تو پھر کھڑے کیا کر رہے ہو۔ آگرہ والے کی دوکان پر آدمی بھیجو۔"

کملا "تمہارے لئے کیا لاؤں بھابھی؟"

سیوتی "دودھ کے گلّے۔"

کملا "اور بھیّا کے لئے؟"

سیوتی "دو دو لتیاں۔"

یہہ کہکر دونوں قہقہے لگانے لگے۔

--- ❋ ---
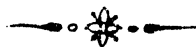
ساتویں فصل

سرد مہری محبت کو بھلا نہیں سکتی

شسباما دل وجان سے شادی کی تیاریوں میں معروف ہوگئی۔ صبح سے شام تک
شادی ہی کے دھندوں میں الجھی رہتی۔ سوسیلا لونڈیوں کی طرح اُسکے حکم کی تعمیل کیا کرتی۔
منشی سجیون لال صبح سے شام تک بازار کی خاک چھانتے رہتے۔ اور برجن جسکے لئے یہ سب
تیاریاں ہورہی تھیں اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی رات دن رویا کرتی۔ کسی کو اتنی فرصت بھی
نہ تھی کہ دم بھر کو اُسکا دل بہلائے۔ یہانتک کہ پرتاپ بھی اب اُسکی صورت سے بیزار نظر آتا۔
وہ اندنوں بہت اُداس رہتا تھا۔ سویرے کا نکلا ہوا شام کو گھر آتا۔ اور اپنی منڈیر پر چپ چاپ
جا بیٹھتا۔ برجن کے گھر جانیکی تو اُسنے قسم سی کھالی تھی۔ بلکہ جب کبھی وہ آتی ہوئی دکھائی دیتی
تو چپکے سے سرک جاتا۔ یا اگر کہنے سُننے سے بیٹھتا بھی تو کچھ اس طرح منہ پھیر لیتا۔ اور ایسی خشکی
سے پیش آتا کہ برجن رونے لگتی۔ اور شسباما سے جاکر کہتی چچی للو مجھسے ناراض ہیں۔ میں بلاتی ہوں
نہیں بولتے۔ تم چلکر منا دو۔ یہ کہکر وہ مچل جاتی۔ اور شسباما کا آنچل پکڑ کر کھینچتی ہوئی پرتاپ
کے گھر لاتی۔ جیسے کوئی فریادی اپنے حمایتی کو ساتھ لائے۔ مگر پرتاپ دونوں کو دیکھتے ہی نکل
بھاگتا۔ برج رانی دروازہ تک اُسکے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی آتی کہ للو ذرا سُن لو۔ ذرا سن لو۔ تمھیں
ہماری قسم ذرا سن لو۔ مگر جب وہ نہ سُنتا۔ اور نہ مُنہ پھیر کر دیکھتا تو بیچاری لڑکی زمین پر بیٹھ
جاتی۔ اور خوب پھوٹ پھوٹ کے روتی۔ اور کہتی یہ مجھسے کیوں روٹھے ہوئے ہیں۔
میں نے تو انھیں کبھی کچھ نہیں کہا۔ شسباما اُسے سینہ سے لگالیتی اور سمجھاتی بیٹی جانے

دو۔ للّو پاگل ہوگیا ہے۔ اُسے بیٹے کی اس سرد مہری کا کچھ کچھ راز معلوم ہو چلا تھا۔

آخر شادی کو صرف پانچ دن رہ گئے۔ عزیز و اقارب دور و نزدیک سے آنے لگے۔ برجن کو باہر نکلنے کی ممانعت ہو گئی۔ کنگن بندھ گیا۔ آنگن میں خوبصورت منڈوا چھا گیا۔ یہہ کچے دھاگے کا کنگن پاک فرائض کی ہتھکڑی ہے جو کبھی ہاتھ سے نہ نکلیگی اور یہ منڈوا اُس محبت و شفقت کے سایہ کی یادگار ہے جو مرتے دم تک سر سے نہ اُٹھیگا۔ آج شام کو سُبا ما۔ سوسیلا۔ مہاجنیں سب کی سب ملکر دیوی جی کی پوجا کرنے گئیں۔ مہریاں اپنے دھندوں میں لگی ہوئی تھیں۔ برجن گھبرا کر اپنے کمرہ سے نکلی۔ اور پرتاپ کے گھر آپہونچی۔ چوطرفہ سناٹا چھایا ہوا تھا صرف پرتاپ کے کمرے میں دھندھلی روشنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ برجن کمرہ میں داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ میز پر لیمپ روشن ہے۔ اور پرتاپ ایک کھری چارپائی پر پڑا سو رہا ہے۔ دھندلی روشنی میں اُسکا چہرہ بہت پژمردہ اور مغموم نظر آتا تھا۔ چیزیں سب اِدھر اُدھر بے قرینہ پڑی ہوئی ہیں فرش پر منوں گرد جمع ہو گئی ہے۔ کتابیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کمرہ کو کسی نے مہینوں سے نہیں کھولا۔ یہہ وہی پرتاپ ہے جو صفائی پر جان دیتا تھا۔ برجن نے چاہا اُسے جگا دوں۔ مگر پھر کچھ سوچکر زمین سے کتابیں اُٹھا اُٹھا کر الماریوں میں رکھنے لگی۔ میز پر سے گرد جھاڑی۔ تصویروں کے مُنہ پر سے گرد کی نقاب اُٹھائی۔ دفعتہً پرتاپ نے کروٹ بدلی اور اُسکی زبان سے یہہ الفاظ نکلے "برجن میں تمھیں بھول نہیں سکتا۔" پھر ذرا دیر کے بعد "برجن! برجن! کہاں جاتی ہو۔ یہیں بیٹھو۔" پھر کروٹ بدلکر "نہ بیٹھوگی۔ اچھا جاؤ۔ میں بھی تم سے نہ بولونگا۔" پھر ذرا اٹھ کر "اچھا جاؤ دیکھیں کہاں جاتی ہو" یہہ کہکر وہ لپکا۔ جیسے کسی بھاگتے ہوئے آدمی کو پکڑ رہا ہو۔ برجن کا ہاتھ اُسکے ہاتھ میں آگیا۔ اسکے ساتھ ہی آنکھیں کھُل گئیں ایک منٹ تک اُسکی

بے معنی نگاہیں برجن کے چہرہ پر گڑی رہیں۔ پھر چونک کر اُٹھ بیٹھا اور برجن کا ہاتھ چھوڑ کر بولا تم کب آئیں برجن۔ میں ابھی تمہارا خواب دیکھ رہا تھا۔

برجن نے بولنا چاہا۔ مگر گلا روندھ گیا۔ اور آنکھیں بھر آئیں۔ پرتاپ نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر پھر کہا "کیا یہ سب تم نے صاف کیا۔ تمھیں بڑی تکلیف ہوئی"۔ برجن نے اسکا بھی کچھ جواب نہ دیا۔

پرتاپ۔ "برجن تم مجھے بھول کیوں نہیں جاتیں؟" مگر دل نہیں

برجن نے پُرنم آنکھوں سے دیکھکر کہا "کیا تم مجھے بھول گئے؟"

پرتاپ نے نادم ہو کر سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خیالات سے بھرے زمین کی طرف تکتے رہے۔ پھر برجن نے پوچھا "تم مجھسے کیوں ناراض ہو۔ میں نے کوئی خطا کی ہے"۔

پرتاپ۔ "نہ جانے کیوں اب تمھیں دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہیں چلا جاؤں"۔

برجن۔ "کیا تمکو میری ذرا بھی محبت نہیں معلوم ہوتی۔ میں دن بھر رویا کرتی ہوں تمھیں مجھپر ترس نہیں آتا۔ تم مجھ سے بولتے تک نہیں۔ بتلاؤ میں نے تمھیں کیا کہا کہ تم اتنا روٹھ گئے"۔

پرتاپ۔ "میں تم سے روٹھا تھوڑے ہی ہوں"۔

برجن۔ "تو مجھسے بولتے کیوں نہیں؟"

پرتاپ۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھیں بھول جاؤں۔ تم امیر ہو۔ تمہارے ماں باپ امیر ہیں۔ میں یتیم ہوں۔ میرا تمہارا کیا ساتھ ہے"۔

برجن۔ "اب تک تو تم نے کبھی یہ حیلہ نہیں نکالا تھا۔ کیا اب میں زیادہ امیر ہو گئی"۔

یہ کہکر برجن رونے لگی - پرتاپ بھی پسیجا - بولا برجن - ہمارا تمہارا بہت دنوں تک ساتھ رہا - اب بچھڑنے کے دن آگئے - چند دن میں تم یہاں والوں کو چھوڑ کر اپنے سسرال چلی جاؤ گی - اسوقت مجھے ضرور ہی بھول جاؤ گی - اس لئے میں بھی چاہتا ہوں کہ تمھیں بھول جاؤں - مگر کتنا ہی چاہتا ہوں کہ تمہاری باتیں یاد نہ آئیں وہ نہیں مانتیں - ابھی سوتے سوتے تمہارا ہی سپنا دیکھ رہا تھا "

آٹھویں فصل

ڈپٹی شیاماچرن کا مکان آج حسینوں کے جمگھٹ سے اِندر کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔
سیوتی کی چار سہیلیاں رُکمنی۔ سیتا۔ رام دیئی۔ چندر کنور سولہوں سنگار کیے اٹھلاتی پھرتی تھیں
ڈپٹی صاحب کی بہن جانکی کنور بھی اپنی دو لڑکیوں کے ساتھ اٹاوہ سے آگئی تھیں اِن دونوں کا
نام کملا اور اُمادیئی تھا۔ کملا کا بیاہ ہو چکا تھا۔ اُمادیئی ابھی کنواری تھی۔ دونوں آفتاب و مہتاب۔
منڈپ کے تلے ڈومنیاں اور گائنیں سُہاگ اور سہرا الاپ رہی تھیں۔ گلبیا نائن اور جمنی بارِن
دونوں شوخ رنگ کی ساڑیاں پہنے۔ مانگ سیندور سے بھروائے گلٹ کے کڑے پہنے چھم چھم
کرتی پھرتی تھیں۔ گلبیا شوخ و فتنگ اور نوجوان تھی۔ جمنی کا سن ڈھل چکا تھا۔ سیوتی کا
کیا پوچھنا۔ آج اُس پر غضب کا نکھار تھا۔ رسیلی آنکھیں فرطِ مسرت سے متوالی ہو رہی تھیں۔ اور گلابی
ساڑی کی جھلک سے چمپئی رنگ گلابی نظر آتا تھا۔ دھانی مخمل کی کُرتی اُس پر خوب کھلتی تھی۔
ابھی نہا کر آئی تھی۔ اسلئے ناگن کی سی لٹیں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ چھیڑ چھاڑ اور چہل سے
اتنی فرصت بھی نہ ملتی تھی کہ ذرا بال گوندھائے۔ گہنے باہر سُنار صاف کر رہا تھا۔ ہاتھوں میں
صرف کڑے تھے۔ یہہ سادگی اُس پر ہزار زیوروں سے زیادہ زیب دیتی تھی۔ مہاجن کی بیٹی مادھوی
چھینٹ کا چکلے دار لہنگا پہنے آنکھوں میں کاجل لگائے اندر باہر ایک کیے ہوئے تھی۔
رُکمنی نے سیوتی سے کہا "سنو تمہاری بھاوج کہاں ہیں۔ دکھائی نہیں دیتیں۔ کیا ہم لوگوں سے

بھی پردہ ہے"

رام دیئی۔ (مسکراکر) "پردہ کیوں نہیں۔ ہماری نظر نہ لگجائیگی"

سیوتی۔ "کمرہ میں پڑی سو رہی ہونگی۔ دیکھو ابھی کھینچے لاتی ہوں"

یہہ کہکر وہ چندرا کے کمرہ میں پہونچی۔ وہ ایک معمولی سی ساڑی پہنے۔ چارپائی پر پڑی دروازہ کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھی۔ اسے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ سیوتی نے کہا "یہاں کیا پڑی ہو۔ اکیلے تمہارا جی نہیں گھبراتا"

چندرا۔ "اُدھر کون جائے ابھی کپڑے نہیں بدلے"

سیوتی۔ "تو بدلتی کیوں نہیں۔ سکھیاں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں"

چندرا۔ "ابھی میں نہ بدلونگی"

سیوتی۔ "یہی ضد اچھی نہیں لگتی۔ سب اپنے دل میں کیا کہتی ہونگی۔

چندرا۔ "تمنے تو چٹھی پڑھی تھی۔ آج ہی آنے کو لکھا تھا نہ"

سیوتی۔ "اچھا تو یہہ اُنکا انتظار ہو رہا ہے۔ یہہ کہئے جبھی یہہ جوگ سادھا ہے"

چندرا۔ "دوپہر تو ہوئی شائد اب نہ آوینگے"

اتنے میں کملا اور اُمادیئی دونوں طرارے بھرتی آپہونچیں۔ چندرا نے گھونگھٹ نکال لیا۔ اور فرش پر آبیٹھی۔ کملا اُسکی بڑی نند ہوتی تھی۔

کملا۔ "ارے! ابھی تو اُنھوں نے کپڑے بھی نہیں بدلے"

سیوتی۔ "بھیّا کی باٹ جوہ رہی ہیں۔ اسی لئے یہہ بھیس رچا ہے"

کملا۔ "پاگل ہیں اُنھیں غرض ہوگی آپ آئیں گے"

سیوتی۔ "انکی دنیا نرالی ہے"

کملا - "مردوں کی محبت چاہے کتنی ہی کرے۔ مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالے۔ نہیں تو وہ شیر ہو جاتے ہیں۔ خواہ مخواہ ستانے اور جلانے لگتے ہیں۔ اگر تم انکی کچھ پروا نکرو۔ اُن سے سیدھے بات نہ کرو۔ تو تمہاری ہر طرح خاطر کرینگے۔ تم پر جان واریں گے۔ مگر جوں ہی اُنھیں معلوم ہوا کہ اب اسکے دل میں میری جگہہ ہو گئی۔ بس اُسی دن سے اُنکی نگاہ پلٹ جائیگی۔ سیر کو جائینگے۔ تو خواہ مخواہ دیر کر کے آئینگے۔ کھانے بیٹھیں گے تو مُنہ چھوٹا کر کے اُٹھ جائینگے۔ بات بات پر روٹھیں گے۔ تم روٹھو گی تو منائیں گے۔ اور دل میں خوش ہونگے کہ کیسا اُسکا رپھانسا ہے۔ تمہارے سامنے دوسری عورتونکی تعریف کرینگے۔ غرض تمھیں جلانے میں اُنھیں مزہ آنے لگیگا۔ اب میرے ہی گھر میں دیکھو۔ پہلے اتنی خاطر کرتے تھے کہ کیا بتاؤں۔ ہر دم نوکروں کی طرح ہاتھ باندھے حاضر۔ پنکھا جھلنے کو موجود۔ ہاتھ سے لقمہ کھلانے کو موجود۔ یہانتک کہ دسکرا کر، پیر دبانے سے بھی عار نہ تھا۔ بات مُنہ سے نکلی نہیں اور پوری ہوئی۔ میں اُسوقت ایسی تھی۔ مردوں کے داؤں پیچ کیا جانوں۔ دم میں آگئی۔ سیونتی جھوٹھ نہ ماننا اُسی دن سے اُنکی آنکھ بدل گئی لگے سیر سپاٹا کرنے۔ ایک روز روٹھ کر چلدیئے۔ آدھی رات کو گجرا گلے میں ڈالے۔ عطر میں بسے ہوئے گھر آئے۔ بچّہ سمجھے تھے کہ آج ہاتھ باندھکر کھڑی ہو گی۔ میں نے لمبی تانی تو رات بھر کروٹ نہ بدلی۔ دوسرے دن بھی نہ بولی۔ آخر لالہ جی آئے۔ پیروں پر گرے۔ گڑگڑائے۔ تب سے میں نے یہ بات گرہ باندھ لی ہے کہ مردوں سے کبھی محبت نہ جتاؤ۔

سیونتی - "جیجا کو میں نے دیکھا ہے بھیّا کی شادی میں آئے تھے۔ بڑے ھنس مکھ آدمی ہیں"

کملا - "پاربتی ان دنوں پیٹ میں تھی۔ اسی سے میں نہ آسکی تھی۔ یہاں سے گئے تو لگے تمہاری تعریف کرنے۔ تم کبھی پان دینے گئی تھیں۔ کہتے تھے کہ میں نے ہاتھ پکڑ کر

بیٹھالیا اور خوب خوب باتیں ہوئیں۔"

سیوتی (ہنسکر) "جھوٹھے ہیں زمانہ کے۔ لباڑیے۔ بات یہہ ہوئی کہ گلبیا اور جمنی دونوں کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ اماں نے کہا وہ کھاکے گئے ہیں۔ پان بناکے دے آ۔ میں پان لیکر گئی۔ چارپائی پر لیٹے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے۔ میں نے پان دینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو آپ نے کلائی پکڑلی۔ اور کہنے لگے کہ ایک بات سُن لو۔ ایک بات سُن لو۔ مگر میں ہاتھ چھڑا کر بھاگی۔"

کملا۔ "نکلی نہ جھوٹی بات۔ وہی تو میں بھی کہوں کہ ابھی گیارہ بارہ برس کی چھوکری۔ اُسنے اُنسے کیا باتیں کی ہونگی۔ مگر نہیں اپنی ہی ضد کئے جائیں۔ مرد بڑے ڈینگئے ہوتے ہیں۔ میں نے یہ کہا میں نے وہ کہا۔ میرا تو اِن باتوں سے جی جلتا ہے۔ نہیں معلوم اُنھیں اپنے اوپر جھوٹی تہمت لگانے میں کیا مزہ آتا ہے۔ آدمی جو بُرا بھلا کرتا ہے۔ اُسپر پردہ ڈالتا ہے۔ مگر یہہ لوگ کرینگے تو تھوڑا اور ڈونگ مارنے کو ہر دم تیار۔ میں تو جب سے اُنکی ایک بات بھی سچ نہیں مانتی۔"

اتنے میں گلبیا نے آکر کہا "تم تو یہاں ٹھاڑھی بتلات ہو۔ اور تمہار سکھی تمکا آنگن میں بلوتی ہیں۔"

سیوتی۔ "دیکھو بھابھی اب دیر نکرو۔ گلبیا ذرا انکے صندوق سے کپڑے تو نکال لے۔"

کملا چندرا کا سنگار کرنے لگی۔ سیوتی سہیلیوں کے پاس آئی۔ رُکمنی بولی "واہ بہن خوب! وہاں جاکر بیٹھ رہیں۔ تمہاری دیواروں سے ہنسیں بولیں کیا؟"

سیوتی۔ "کملا بہن چلی گئیں۔ اُنسے بات چیت ہونے لگیں۔ دونوں آرہی ہیں۔"

رُکمنی۔ "لڑکوری ہیں نہ؟"

سیوتی۔ "تین ہوئے تھے ایک پارسال مرگیا۔ دو موجود ہیں۔"

رام دیئی۔ "مگر کاٹھی بہت اچھی ہے"

چندر کنور۔ "مجھے اُنکا بانک بہت پسند آیا۔ جی چاہتا ہے چھین لوں"

سیتا۔ "بانک واقعی اچھا ہے۔ دونوں بہن ایک سے ایک بڑھکر ہیں"

رکمنی۔ "اگئی طبیعت۔ اُما دیئی مرد ہوئیں نہیں تو تم جان دینے لگتیں"

سیتا۔ "دوسروں پر تو وہ جان دے جسکا دولھا کم رو ہو۔ یہاں تو لاکھ دو لاکھ میں ایک ہے"

رُکمنی کے شوہر ذرا رنگ کے گہرے تھے۔ اور نقشہ بھی سڈول نہ تھا۔

رُکمنی۔ "صورت لیکر چاٹی نہیں جاتی"

سیتا۔ "وہ تو دل ہی جانتا ہوگا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ چاہے روکھی روٹی کھانے کو ملے۔ جھونپڑے میں رہنا پڑے۔ مگر صورت دیکھتے ہی سب دُکھ دور ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ بھجنگی صورت دیکھکر بخار چڑھ آئے۔ جی متلانے لگے"

سیوتی۔ "سیتا کو ایشور نے بڑا اچھا دیا ہے اسنے سونے کی گور پوجی تھی"

رکمنی (جلکر) "گورے چمڑے سے کچھ نہیں ہوتا"

سیتا۔ "تمھیں کالا ہی پسند ہوگا"

سیوتی۔ "مجھے کالا بر ملتا تو زہر کھا لیتی۔"

رُکمنی۔ "یوں کہنے کو جو چاہے کہہ لو۔ مگر سچ پوچھو تو آرام کالے ہی دولھا سے ملتا ہے"

سیوتی۔ "آرام نہیں خاک ملتا ہے۔ گہن سا آکے لپٹ جاتا ہوگا"

رُکمنی۔ "یہی تو تمہاری لڑکپن کی باتیں ہیں۔ تم جانتی نہیں خوبصورت مرد ہمیشہ اپنے ہی بناؤ سنگار میں لگا رہتا ہے۔ اُسے اپنے آگے بیوی کا کچھ خیال نہیں رہتا۔ اگر عورت بیحد خوبصورت ہے تو خیر۔ ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اُس سے بھاگنے لگتا ہے۔ وہ

سمجھتا ہے کہ میں ایسی دوسری عورتوں کے دل پر آسانی سے قابو پا سکتا ہوں۔ بیچارہ کالا کلوٹا آدمی خوبصورت بیوی پا جاتا ہے تو سمجھتا ہے مجھے ہیرے کی کھان مل گئی۔ صورت کی کسر وہ پیار اور خاطر داری سے پوری کرتا ہے۔ اُسکے دل کو ہمیشہ یہ دغدغہ لگا رہتا ہے کہ میں ذرا بھی اِس سے ترش ہوا تو وہ مجھسے نفرت کرنے لگیگی۔ میں اگر آدھی رات کو کہوں کہ گرم گرم حلوے کھلاؤ۔ تو ممکن نہیں کہ اسیوقت حکم کی تعمیل نہ کریں۔ آج کسی گہنے کی فرمایش کردوں۔ تو کل بیچکر حاضر کریں۔"

چندر کنور:۔ "دولہا سب سے اچھا وہ جو مُنہ سے بات نکلتے ہی پوری کرے۔"

رام دیئی:۔ "تم اپنی بات نہ چلاؤ۔ تمھیں تو اچھے اچھے گہنوں سے سروکار ہے۔ دولہا کیسا ہی ہو۔"

سیتا:۔ "نہیں معلوم کوئی اپنے مرد سے کسی چیز کی فرمایش کیونکر کرتا ہے۔ کیا لحاظ نہیں معلوم ہوتا۔"

رُکمنی:۔ "تم بیچاری کیا فرمایش کروگی۔ کوئی بات تو پوچھے۔"

سیتا:۔ "میرا تو اُنھیں دیکھ ہی کے جی بھر جاتا ہے۔ گہنے کپڑے کی طرف طبیعت نہیں جاتی۔"

سیوتی:۔ "ستیا کا خوب جوڑ ہے۔"

رام دیئی:۔ "جوڑ جو سچ پوچھو تو چندر کنور اور کلونت رائے کا خوب ہے۔"

سیوتی:۔ "یہ انھیں دباتی ہونگی تو بیچارے گھگھیانے لگتے ہونگے۔"

چندر کنور بھاری بھرکم گداز جسم کی نازنین تھی۔ کلونت رائے منحنی اور ضعیف الاعضا تھے۔

رام دیئی:۔ "اپنی قسمت کو کوستے ہونگے کہ ایسی دیونی کہاں سے پائی۔"

چندر کنور:۔ "جب دیکھو بدہضمی کی شکایت۔ دو چپاتیاں کھائیں جب بھی بدہضمی۔ ذرا سا دودھ پئیں جب بھی بدہضمی۔ ناک میں دم ہے۔"

سیوتی:۔ "بیچارے تم سے ڈرتے ہونگے۔"

سیتا۔ "انکے سامنے بچے معلوم ہوتے ہیں - یہ چاہیں تو انھیں گود میں کھلائیں"
رکمنی۔ (جلبکر) "بس سارے زمانے میں ایک تم اچھی اور ایک تمہارا دولھا - باقی سب بے جوڑ - انمل"
سیتا۔ "تمھیں کاہیکو کڑوا لگتا ہے"

اتنے میں ایک اور نازنین جلوہ افروز ہوئی - گہنے سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی - پُر تکلف جوڑا پہنے - عطر میں بسی - سرمہ مسی سے لیس - آنکھوں سے شوخی و شرارت برس رہی تھی -

رام دیی۔ "آؤ رانی آؤ - تمہاری ہی کسر تھی"
رانی۔ "کیا کروں نگوڑی نائن سے کسی طرح پیچھا ہی نہ چھوٹتا تھا - کلثوم کی ماں آئی - تب جاکے جوڑا بندھا"
سیتا۔ "تمہاری جاکٹ پر تھپا ورہونیکو جی چاہتا ہے"
رانی۔ "اسکا قصہ کچھ نہ پوچھو - کپڑا دیئے مہینہ بھر ہوا - دس بارہ مرتبہ درزی سی کرلایا مگر کبھی آستین ڈھیلی کر دی - کبھی بخیہ بگاڑ دیا - کبھی چنٹ خراب کر دی - بارے ابھی چلتے چلتے دیگیا ہے"
سیوتی۔ "البیلے بالم ہیں یہیں - یا کہیں گئے ہوئے ہیں"
رانی۔ "میری بلا جانے - جیسے کنتھا گھر رہے ویسے رہے بدیس"

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ مادھوی غل مچاتی ہوئی آئی بھیا آئے اُنکے ساتھ جیجا بھی ہیں - اوہو ہو"

رانی۔ "کیا رادھا چرن آئے کیا"
سیوتی۔ "ہاں چلو ذرا بھابی کو سندیسا دے آؤں - کیوں رے کہاں بیٹھے ہیں؟"
مادھوی۔ "اُسی بڑے کمرے میں جیجا پگڑی باندھے ہیں بھیا کوٹ پہنے ہیں مجھے بھیّا نے

روپیہ دیا" یہ کہکر اُسنے مٹھی کھولکر دکھائی۔

رانی "ستّو اب منہ میٹھا کراؤ"

سیوتی "کیا میں نے کوئی منت مانی تھی؟"

سیتا "باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ آنکھوں میں نشہ آگیا ہے"

رانی "یہ سادگی تم پر خوب پھبتی ہے۔ خاصی پری معلوم ہوتی ہو"

سیوتی چندرا کے کمرہ میں آکر بولی "لو بھابی تمہارا شگون ٹھیک اُترا"

چندرا "کیا آگئے۔ ذرا جا کے اندر بلالو"

سیوتی "ہاں مردانے میں چلی جاؤں۔ تمہارے بہنوئی صاحب بھی تو بیٹھے ہیں"

چندرا "باہر بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ کسی کو بھیجکر بلا لیتیں۔ نہیں تو دوسروں سے باتیں کرنے لگیں گے"

یکایک کھڑاؤں کی آواز آئی۔ اور رادھا چرن آتے دکھائی دیئے۔ سن چوبیس پچیس سال سے زائد نہ تھا۔ بہت ہی خوشرو۔ سُرخ و سفید۔ انگریزی تراش کے بال۔ فرنچ تراش کی داڑھی۔ کھڑی مونچھیں۔ لیونڈر کی لپٹیں آرہی تھیں۔ بدن پر صرف ایک ریشمی مہین کُرتا تھا۔ آکر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اور سیوتی سے بولے "کیوں ستّو۔ ہفتہ بھر سے خط نہیں بھیجا"

سیوتی "میں نے سوچا اب تو آہی رہے ہو۔ کیا خط بھیجوں"

یہ کہکر سیوتی وہاں سے کھسک گئی۔ چندرا نے گھونگھٹ اُٹھا کر کہا "وہاں جا کر بھول جاتے ہو"

رادھا چرن (گلے سے لگاکر) جب ہی سیکڑوں کوس سے دوڑا چلا آتا ہوں"

نویں فصل

بارات کی رخصتی

بارات دھوم دھام سے گئی۔ اور تین دن مقیم رہی۔ شب و روز عیش و مسرت کے
جلسے ہوتے رہے۔ پہلے دن آدھی رات کیوقت منڈپ کے نیچے شادی کے مراسم ادا کئے گئے۔
تمام باراتی فرش پر بیٹھے۔ برجن ایک شنگرفی رنگ کی ساڑی پہنے لمبا سا گھونگھٹ نکالے
آئی۔ اور کملا چرن کے بغل میں بٹھائی گئی۔ ہون ہوا۔ سنسکرت کے اشلوک پڑھے گئے جو دولھا
دلھن کے سمجھ میں بالکل نہ آئے۔ عورتوں نے سُہاگ کے گیت گائے۔ پھر دولھا دولھن
نے ہون کنڈ کا سات بار طواف کیا۔ اسکے بعد دولھا کہبر میں گیا۔ جہاں عورتوں نے اُسے
برجن کا جھوٹا پان کھلایا۔ تاکہ وہ ہمیشہ بیوی کا غلام بنا رہے۔ اُس سے غزل پڑھنے کی فرمائش
کی جسکی تعمیل وہ نکر سکا۔ پھر اُسکے وضع و قطع اور حسب و نسب کی ھنسی اُڑائی۔ اُسکی ماں کو اور
باپ کو اور بہنوں کو خدا معلوم کیسی کیسی فحش گالیاں دیں جو دولھا کو ذرا بھی ناگوار نہ معلوم ہوئیں
بلکہ وہ خوش ہو ہو کر سُنتا رہا۔ دوسرے دن دس بجے کلیوا کا رسم ہوا۔ نوشہ مع خاص خاص
رشتہ داروں کے آنگن میں بیٹھا۔ باسی پوریاں اُسکے سامنے ایک طشت میں لائی گئیں۔
منشی سجیون لال نے پانچ اشرفیاں تھالی کے پاس رکھدیں۔ اور چمکار کر کہا بیٹا کھاؤ۔
مگر نوشہ نے ہاتھ نہ بڑھایا۔ تب ایک سونے کی انگوٹھی سا ایک دوشالہ جسپر زریں کام بنا ہوا
تھا۔ ایک چاندی کا گلاس۔ دو چاندی کے کٹورے اور کچھ برتن لاکر رکھے گئے۔ تسپر بھی نوشہ

نے پوریوں کی طرف نظر اُٹھاکر نہ دیکھا۔ سجیون لال نے رادھاچرن کی طرف دیکھکر کہا بابو صاحب۔ اب آپ کھانے کی اجازت دیجیئے۔ بابو صاحب نے سنکر کہا میں نے منع تھوڑا ہی کیا ہے۔ کھاتے کیوں نہیں۔ کملو کھالو۔ کملو نے بھائی کیطرف دیکھا۔ مگر بجائے اجازت کے ممانعت پائی۔ سجیون لال گھر میں گئے۔ ایک موہن مالا اور دو انگوٹھیاں اور لائے۔ اور پھر نوشہ سے ماحضر تناول فرمانے کی التجا کی۔ رادھاچرن نے کملا سے کہا خاموش کیوں بیٹھے ہو۔ جو کچھ عرض کرنا ہو صاف صاف دیوان صاحب سے کرو۔ کملا کے بہنوئی پران ناتھ نے کہا نوشہ کی طرف سے میں ایک گھوڑے کی درخواست کرتا ہوں۔ منشی جی پھر گھر میں گئے۔ سُبا ما سے کہا یہ لوگ پورے ڈاکو ہیں۔ دو ڈھائی سو ڈکار گئے۔ اب سواری کے لئے گھوڑا مانگتے ہیں۔ سُبا مانے جواب دیا گھوڑا مانگتے ہیں گھوڑا دیجیئے۔ اُنکی خواہش تو پوری ہو۔ منشی جی نے مجبور ہوکر اپنے ٹمٹم کا گھوڑا دیدیا۔ تب کملا چرن نے نوالہ اُٹھایا اور گن کر پانچ بار لقمہ مُنہ تک لیگئے۔ شام کے وقت باراتیوں کی ضیافت ہوئی۔ تکلف سے کھانا رکھا گیا۔ لوگ کھانے بیٹھے۔ ڈومنیاں اندر گانے لگیں۔

آپ تو لالہ نیوتے میں آئے۔ میّا کسے دے آئے۔ ارے بہنا کسے دے آئے

پھوپھی تمہاری مدرکی ماتی اُسکو نہ کیوں لے آئے۔ کسے سونپ آئے۔

منشی پیارے لال نے فرمایا پران ناتھ گالیوں کے از حد مشتاق ہیں۔ ڈومنیوں نے دوسرے گیت میں اُنکی خبر لی۔

پران ناتھ بابو تم ہو ابھی نادان۔

بہن تمہاری بہت سیانی۔ گھر گھر ہوت بکھان۔ تم ہو ابھی نادان

سیج پہ اُسکے نس دن آتے۔ دس دس سجن سُجان۔ تم ہو ابھی نادان

ڈپٹی شیاما چرن نے فرمایا پیارے لال کو کیوں چھوڑتی ہو۔ انکے بہن کا نام چمپا ہے۔ ڈومنیوں نے گایا۔

چمپا تیری کلیاں بہت سہانی۔ رنگ تیرا مجھے بھایا۔ رنگ تیرا مجھے بھایا۔

تیری صورتیا چت سے نہ اترے۔ تونے مجھے اپنایا۔ رنگ تیرا مجھے بھایا۔

اسی طرح فرمائشیں کرکر کے لوگ گالیاں سنا کئے۔ کوئی باقی نہ بچا۔ یہانتک کہ گاتے گاتے ڈومنیوں کا جی اکتا گیا۔ مگر سننے والوں کو سیری نہوئی۔ منشی پیارے لال نے پھر تازہ فرمائش کی۔ ڈومنیوں نے فحش گالیاں دینی شروع کیں۔ آخر آٹھ بجتے بجتے کھانا ختم ہوا۔ تیسرے دن رخصتی کا وقت تھا۔ علی الصباح باراتی اصحاب منڈپ کے نیچے جمع ہوئے۔ منشی سجیون لال اور انکے رشتہ دار باراتیوں سے بغلگیر ہوئے نو بجتے بجتے بارات رخصت ہوگئی۔ آئی تھی کس شان سے گئی بالکل اسطرح جیسے کوئی شکست خوردہ فوج۔ گائنوں نے رخصتانے کے گیت گائے۔ منشی شیاما چرن نے گالی گانے کے لئے ایک اشرفی انعام دی۔ کملا چرن اندر گئے ساس نے چھاتی سے لگایا چلتے وقت پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ شادی بڑی خوبی سے انجام کو پہونچی۔ شہر میں چاروں طرف واہ واہ کی دھوم مچگئی۔

—※—

دسویں فصل

حسد

پرتاپ چند نے برجن کے گھر آنا جانا شادی کے کچھ دن پہلے ہی سے ترک کر دیا تھا۔ شادی کے کسی کام میں نہ شریک ہوا۔ حتیٰ کہ محفل میں بھی نہ گیا مغموم صورت بنائے۔ مُنہ لٹکائے اپنے کمرہ میں بیٹھا رہا۔ منشی سجیون لال۔ سوسیلا۔ سُبا ماسب خوشامدیں کر کے ہار گئے۔ مگر اُسنے بارات کی طرف رخ تک نہ کیا۔ آخر میں منشی جی کبیدہ خاطر ہو گئے۔ اور پھر اُس سے کچھ نہ کہا۔ یہہ کیفیت شادی کے ہونے تک تھی۔ شادی کے بعد سے تو اُس نے اُدھر کا راستہ ہی ترک کر دیا۔ مدرسے جاتا تو اسطرح کتراکر نکل بھاگتا گویا سامنے کوئی شیر بیٹھا ہوا ہے۔ یا جیسے تقاضا کرنیوالے مہاجن کے سامنے سے مقروض آدمی نظریں بچاکر نکل جاتا ہے۔ برجن کی تو پرچھائیں سے بھاگتا۔ اگر کبھی اُسے اپنے گھر میں دیکھ پاتا تو اندر قدم نہ رکھتا۔ ماں سمجھاتی بیٹا تم برجن سے بولتے چالتے کیوں نہیں۔ کیوں اُس سے من موٹا کئے ہوئے ہو۔ وہ آآ کر گھنٹوں روتی ہے۔ کہ میں نے کیا کیا کہ جس سے یہ ناراض ہو گئے۔ دیکھو تم اور وہ کتنے دنوں تک یکساتھ رہے ہو۔ تم اُسے کتنا پیار کرتے تھے۔ یکا یک تم کو کیا ہو گیا۔ اگر تم اسی طرح روٹھے رہے تو غریب لڑکی کی جان پر بنجائیگی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ ایشور جانتا ہے مجھے اُسے دیکھکر ترس آتا ہے۔ سوائے تمہارے ذکر کے اُسے جیسے کوئی دوسری بات ہی نہیں معلوم۔ پرتاپ آنکھیں نیچے کئے ہوئے یہہ سب سُنتا۔ اور چپ چاپ سرک جاتا۔

پرتاپ اب کمسن بچّہ نہ تھا۔ اُسکی زندگی کے پودھے میں شباب کی کوپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اُسنے بہت دنوں سے۔ اسیوقت سے جبکہ اُسنے ہوش سنبھالا۔ اپنے طفلانہ خوابوں میں برجن کی زندگی کو اپنی زندگی سے شیر و شکر کی طرح ملا لیا تھا۔ اُن دلفریب اور سہانے خوابوں کا اس بیدردی اور بیرحمی سے خاک میں ملایا جانا اُسکے نازک دل کو پارہ پارہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ جو اپنے خیال میں برجن کا سب کچھ تھا کہیں کا نرہا۔ اور وہ جس نے برجن کو ایک لمحہ کے لئے بھی خیال میں جگہ ندی اُسکا سب کچھ ہو گیا۔ اس خیال سے اُسکے دل میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی۔ اور جی چاہتا کہ جن لوگوں نے میرا طلسم خواب یوں توڑا ہے۔ اور میری زندگی کی آرزوئیں یوں مٹی میں ملائی ہیں انھیں میں بھی جلاؤں اور سلگاؤں۔ سب سے زیادہ غصّہ اُسے جسپر آتا وہ غریب سوشیلا تھی۔

رفتہ رفتہ اُسکی یہہ حالت ہوگئی کہ جب مدرسے سے آتا تو کملاچرن کے متعلق کوئی نہ کوئی روایت غرور بیان کرتا۔ خصوصاً اسوقت جبکہ سوشیلا بیٹھی ہوتی۔ اس غریب کا دل دُکھانے میں اُسے خاص مزہ آتا۔ اگرچہ جھوٹ بولنے کی اُسے عادت نہ تھی۔ جو کچھ وہ کہتا وہ حقیقت ہوتی تھی۔ مگر نادانستہ طور پر اُسکا طرز بیان۔ اور انداز تقریر کچھ ایسا دلخراش ہو جاتا کہ سوشیلا کے جگر میں تیر کی طرح چبھ جاتا۔ آج میاں کملاچرن تپائی کے اوپر کھڑے تھے۔ سر آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ مگر بیچارے اتنے بڑے کہ جب مینے اُنکی طرف اشارہ کیا تو کھڑے کھڑے ہلنے لگے۔ آج بڑا مزہ آیا۔ کملو نے ایک لڑکے کی گھڑی اُڑا دی۔ اُسنے ماسٹر صاحب سے شکایت کی۔ اُسکے قریب یہی حضرت بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسٹر نے تلاشی لی تو آپکے ازار بند میں گھڑی ملی۔ پھر کیا تھا۔ بڑے ماسٹر کے یہاں نالش ہوئی وہ سنتے ہی جھلا گئے۔ اور کوئی تین درجن قمچیاں رسید کیں۔ سٹر سٹر

ماسٹر تمام اسکول تماشا دیکھتا تھا۔ جب تک قمچیاں پڑا کیں حضرت واد فریاد مچایا کئے۔ مگر باہر نکلتے ہی کھل کھلانے لگے۔ اور مونچھوں پر تاؤ دیا۔ یہ بچی نہیں سنا آج لڑکوں نے عین مدرسے کے دروازے پر کملا پرن کو پیٹا۔ مارتے مارتے بیدم کر دیا علی ہذا۔ آئے دن اس قسم کی وارداتیں بیان کر نیکو ملجاتیں۔ سوسیلا سنتی اور سن سن کر کڑھتی۔ ہاں پرتاپ اس قسم کی کوئی بات برجن کے سامنے نہ کرتا۔ اگر وہ گھر میں بیٹھی بھی ہوتی تو جب تک چلی نہ جاے یہہ تذکرہ نہ چھیڑتا۔ اُسے منظور نہ تھا کہ میری کسی بات سے اسے صدمہ ہو پہنچے۔

پرتاپ کے روایتوں کی تائید اتفاقیہ طور پر منشی سجیون لال نے بھی بارہا کی۔ کبھی کملا بازار میں بلبل لڑاتے مل جاتا۔ کبھی شہدوں کے ساتھ۔ سگرٹ پیتے۔ پان چباتے۔ بد وضعی سے گھومتا ہوا نظر آ جاتا۔ منشی جی جب داماد کی یہہ کیفیت دیکھتے تو گھر آتے ہی بیوی پر غصہ اُتارتے۔ یہ سب تمہارا ہی کرتوت ہے۔ تمہیں سمجھی ہوئی تھیں کہ گھر بر دونوں اچھے ہیں۔ اُنھیں اسوقت یہہ خیال نہ رہتا کہ جتنا الزام سوسیلا پر ہے۔ کم از کم اتنا ہی مجھپر بھی ہے۔ وہ بیچاری تو چار دیواری میں بند تھی۔ اُسے کیا خبر کہ لڑکا کس قماش کا ہے۔ شاید کہ ودیا تھوڑی ہی پڑھی تھی۔ اُسکے ماں باپ کو شریف دیکھا۔ اُسپر عالی خاندان۔ ذی رتبہ۔ راضی ہو گئی۔ مگر منشی جی نے تو محض کاہلی اور سہل انگاری کی وجہ سے چھان بنان نہیں کی۔ حالانکہ انھیں اسکے بہت سے موقع حاصل تھے۔ اور منشی جی کے بیشمار بھائی اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں جو اپنی پیاری لڑکیوں کو اسی طرح آنکھ بند کر کے کنوئیں میں ڈھکیل دیا کرتے ہیں۔

سوسیلا کو دنیا میں برجن سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہ تھی۔ برجن اُسکی جان تھی۔ اُسکا دین تھی اُسکا ایمان تھی۔ اُسمیں اُسکی جان بستی تھی۔ وہ اُسکی آنکھوں کا نور اور اُسکے دل کا سرور تھی۔ اُسکا سب سے بڑا دنیاوی ارمان یہہ تھا کہ میری پیاری برجن اچھے گھر جاے۔ اسکے ساس

سسر دیوی دیوتا ہوں۔ اسکا شوہر شرافت کا پُتلا او سری رامچندر جی کی طرح سویل ہو۔ اُسپر کسی آزار کی پرچھائیں بھی نہ آنے پائے۔ اُسنے مر مرکر بڑی منتوں سے یہہ لڑکی پائی تھی۔ اور اُسکی آرزو تھی کہ اس رسیلی آنکھوں والی۔ اپنی بھولی بھالی لڑکی کو مرتے دم تک آنکھ سے اوجھل نہونے دونگی۔ اپنے داماد کو بلاؤنگی۔ اپنے گھر رکھونگی۔ برجن کے بچے ہونگے۔ اُنکی پرورش کرونگی۔ داماد مجھے اماں کہیگا۔ میں اُسے لڑکا سمجھونگی۔ جس دل میں یہ ارمان ہوں اُسپر ایسی ایسی دلازار۔ اور دلخراش باتوں کا جو کچھ اثر ہوگا ظاہر ہے۔

افسوس! غریب سوسیلا کے سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ اسکی ساری آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ کیا سوچی تھی اور کیا ہوگیا۔ اپنے دل کو بار بار سمجھاتی کہ ابھی کیا ہے۔ سمجھ آجائیگی تو یہہ سب باتیں آپ ہی چھوڑ دیگا۔ مگر ایک شکایت کا زخم بھرنے نہ پاتا کہ پھر کوئی تازہ واردات سُننے میں آجاتی۔ اسی طرح زخم پر زخم پڑتے گئے۔ ہائے انہیں معلوم برجن کے بھاگ میں کیا بدلہے۔ کیا یہہ حُسن و شعور کی پُتلی۔ میرے گھر کا اُجالا۔ میری جسم کی جان اسی بدقماش۔ آوارہ شخص کے ساتھ زندگی کاٹیگی۔ کیا میری شیاما اسی گدھ کے پالے پڑیگی! یہہ سوچکر سوسیلا رونے لگتی اور گھنٹوں روتی۔ پہلے برجن کو کبھی کبھی ڈانٹ ڈپٹ بھی دیا کرتی تھی۔ اب بھولکر بھی کوئی بات نہ کہتی۔ اُسکی صورت دیکھتے ہی اُسے رحم آجاتا۔ ایک لمحہ کے لئے بھی نظروں سے دور نہونے دیتی۔ اگر ذرا دیر کے لئے وہ سُباما کے گھر چلی جاتی تو اُسکے پیچھے لگی خود بھی جا پہونچتی۔ ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی اُسے چھینے لئے جاتا ہے۔ جسطرح اپنے بچے کو قصائی کے پھندے کے نیچے دیکھکر گائے کا رواں رواں کانپنے لگتا ہے۔ اُسی طرح برجن کی مصیبت کا خیال کرکے سوسیلا کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہوجاتی تھی۔ انہوں نے برجن کو دم بھر کے لئے نگاہوں سے دور کرتے اُسے وہ قلق اور گھبراہٹ

ہوتی تھی جو چڑیا کو گھونسلے سے بچّوں کے کھو جانے پر ہوتی ہے۔

سوسیلا ایک تو یوں ہی دائم المریض تھی۔ اُس پر آئے دن کی کوفت اور جلن نے اُسے اور بھی گھُلا ڈالا۔ بیٹی کی فکر سوہان روح ہوگئی۔ شکایتوں نے کلیجہ چھلنی کر دیا۔ چھ مہینہ بھی نہ گذرنے پائے تھے۔ کہ تپ دق کے آثار نمودار ہو گئے۔ پہلے تو ہفتہ عشرہ تک طبیعت پر زور ڈالکر اپنا آزار دل چھپاتی رہی۔ مگر آخر کبتک؟ مرض بڑھنے لگا۔ اور طاقت نے جواب دیدیا۔ قیدِ بستر ہوگئی۔ حکیم اور ڈاکٹر علاج کرنے لگے۔ تین چار مہینہ میں حالت ایسی نازک ہوگئی کہ معالجوں نے بھی علاج سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ برجن اور سُبا ما دونوں شب و روز اُس کے پاس بیٹھی رہتیں۔ برجن ایک لمحہ کو بھی اُسکی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پاتی۔ اُسے اپنے پاس نہ دیکھکر سوسیلا بدحواس سی ہو جاتی۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگتی۔ منشی سجیون لال پہلے تو سرگرمی سے علاج کرتے رہے۔ مگر جب دیکھا کہ کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا۔ اور مریضہ کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے تو آخر انھوں نے بھی مایوس ہو کر ہمت چھوڑ دی۔ آج سے کئی سال پہلے جب سُبا ما بیمار پڑی تھی۔ اسوقت سوسیلا نے اُسکی تیمار داری میں بڑی جانفشانی کی تھی۔ اب سُبا ما کی باری آئی۔ اور اُسنے ہمسائگی اور بہناپے کا حق پوری طرح ادا کر دیا۔ تیمار داری میں اپنے گھر کا کام کاج بھول گئی۔ وہ دو دو تین تین دن تک پرتاپ سے بولنے کی نوبت نہ آتی۔ اکثر وہ بے کھانا کھائے ہی مدرسے چلا جاتا۔ مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتا۔ سوسیلا کی حالت نے اب اُسکی آتش حسد کو بہت مدھم کر دیا تھا۔ حسد کی آگ محسود کی ترقی اور بہتری کے ساتھ تیز اور مشتعل ہوتی جاتی ہے۔ اور اُسی وقت بجھتی ہے جب محسود کی زندگی کا چراغ بجھ جاتا ہے۔ جس دن برج رانی کو معلوم ہو جاتا۔ کہ آج پرتاپ بلا کھانا کھائے مدرسے جا رہا ہے۔

اُسدن وہ سب کام چھوڑ کر اُسکے گھر دوڑی جاتی۔ اور کھانے کے لئے ضد کرتی مگر پرتاپ اُس سے بات تک نکرتا۔ اُسے روتے چھوڑ کر باہر چلا جاتا۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ برجن کو بالکل بنجطا سمجھتا تھا۔ مگر ایک ایسے رشتے کو جو برس چھ مہینے میں منقطع ہونیوالا ہو وہ پہلے ہی سے توڑ دینا چاہتا تھا۔ تنہائی میں بیٹھکر وہ آپ ہی آپ گھنٹوں پھوٹ پھوٹ روتا۔ مگر ضبط کا مادہ اُسکے دل میں کچھ ایسا مضبوط تھا کہ وہ اپنے جوش محبت کو قابو سے باہر نہونے دیتا۔

ایک روز وہ مدرسے سے آکر اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ برجن آئی۔ اُسکے رخسار ے آنسو سے تر تھے۔ اور لمبی لمبی سسکیاں لے رہی تھی۔ اسکے چہرہ پر اسوقت کچھ ایسی حسرت اور بے لبی چھائی ہوئی تھی۔ اور نگاہیں کچھ ایسی التجا آمیز تھیں کہ پرتاپ سے ضبط نہو سکا۔ آبدیدہ ہوکر بولا "کیوں برجن ؟ روکیوں رہی ہو" برجن نے کچھ جواب ندیا۔ بلکہ اور بلک بلک رونے لگی۔ پرتاپ کا ضبط رخصت ہوگیا۔ وہ بیتاب ہوکر اُٹھا اور برجن کے آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا۔ برجن نے آواز سنبھال کر کہا للو اب اماں نہ جئیں گی۔ میں کیا کروں" یہہ کہتے کہتے وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

پرتاپ یہہ خبر سنکر سناٹے میں آگیا۔ بدحواس دوڑا ہوا برجن کے گھر گیا۔ اور سوسیلا کی چارپائی کے پاس کھڑا ہوکر رونے لگا۔ ہمارا آخری وقت کیسا مبارک ہوتا ہے۔ وہ ہمارے پاس ایسے ایسے بیر خونکو کھینچ لاتا ہے جو چند دن پہلے ہماری صورت سے بیزار تھے اور جنھیں سوا اُس طاقت کے دنیا کی کوئی دوسری طاقت زیر نکرسکتی تھی۔ ہاں یہہ وقت ایسا ہی طاقتور ہے۔ وہ بڑے بڑے سرکش دشمنوں کو ہمارا مطیع کر دیتا ہے۔ جنپر ہم کبھی فتح نہ پا سکتے تھے اُنپر یہہ وقت ہمکو فتحمند بنا دیتا ہے۔

جنپر ہم کسی ہتھیار سے غالب نہ آسکتے تھے اُنپر یہہ وقت باوجود قوی کے مضمحل ہو جانے کے ہمکو غالب کر دیتا ہے۔ آج پورے سال بھر کے بعد پرتاپ نے اس گھر میں قدم رکھا۔ سُسیلا کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر چہرہ ایسا شگفتہ تھا جیسے صبح کے وقت کا کنول۔ آج صبح ہی سے وہ رٹ لگائے ہوئے تھی کہ للّو کو دکھا دو۔ سُبا ما نے اسی لئے برجن کو بھیجا تھا۔

سُبا ما نے کہا بہن آنکھیں کھولو۔ للّو کھڑا ہے“

سوسیلا نے آنکھیں کھولدیں۔ اور اپنے دونوں بانو فرط محبت سے پھیلا دیئے۔ پرتاپ کے دل سے کینہ کا آخری نشان بھی محو ہو گیا۔ اگر ایسے وقت میں بھی کوئی انسان دل میں کینہ کا غبار رہنے دے تو وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ پرتاپ سچے فرزندانہ جوش سے آگے بڑھا۔ اور سوسیلا کے آغوش محبت میں جا لپٹا۔ اور دونوں آدھ گھنٹہ تک روتے رہے۔ سوسیلا اُسے دونوں بازؤں سے ایسا دبائے ہوئی تھی گویا وہ کہیں بھاگا جا رہا ہے۔ وہ اسوقت اپنے تئیں صدہا ملامتیں کر رہا تھا۔ میں ہی اس دکھیا کا جان لیوا ہوں۔ میں نے ہی حسد کے کینہ جذبہ سے مغلوب ہو کر اسے اس نوبت کو پہونچایا ہے۔ میں ہی اس پریم کی مورت کا قاتل ہوں۔ جوں جوں یہہ خیالات اُسکے دل میں آتے۔ اُسکے آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ آخر سوسیلا بولی“ للّو! میں دو ایک دن کی اور مہمان ہوں میرا جو کچھ کہا سُنا ہو وہ معاف کرو“

پرتاب کی آواز قابو میں نہ تھی۔ کچھ جواب نہ دیسکا۔

سوسیلا پھر بولی“ نہ جانے کیوں تم مجھسے ناراض ہو۔ تم ہمارے گھر نہیں آتے۔ ہم سے باتیں نہیں کرتے۔ جی تمھیں پیار کرنے کو ترس ترس کے رہ جاتا ہے۔ مگر تم میری ذرا بھی خبر نہیں لیتے۔ بتاؤ۔ اپنی غریب چچی سے کیوں روٹھے ہو۔ ایشور جانتا ہے میں تمھیں ہمیشہ اپنا لڑکا سمجھتی رہی۔ تمھیں دیکھکر میری چھاتی پھول اُٹھتی تھی۔

یہہ کہتے کہتے نقاہت کے باعث اُسکی آواز بہت دھیمی ہوگئی۔ جیسے اُفق کے انتھاہ وسعت میں اُڑنیوالی مرغابی کی آواز ہر لحہ مدھم ہوتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ اُسکی آواز کا صرف خیال باقی رہ جاتا ہے۔ اُسی طرح سوسیلا کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے صرف سائیں سائیں رہ گئی۔
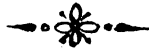
گیارھویں فصل

سوسیلا کی وفات
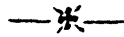
تین دن اور گذرے۔ سوسیلا کے جینے کی اب کوئی آس باقی نرہی تھی۔ تینوں دن منشی سجیون لال اُسکے پاس بیٹھے اُسکی تشفی کرتے رہے۔ وہ ذرا دیر کےلئے بھی کسی کام سے چلے جاتے تو وہ بیقرار ہونے لگتی۔ اور رو رو کر کہتی کہ وہ مجھے چھوڑکر کہیں چلے گئے۔ اُنکو آنکھوں کے سامنے دیکھکر بھی اُسے تسکین نہ ہوتی۔ رہ رہ کر ایک مجنونانہ جوش سے اُنکا ہاتھ پکڑ لیتی اور مایوسانہ لہجہ میں کہتی مجھے چھوڑکر کہیں چلے تو نہ جاؤگے۔ منشی جی گو استقلال کے آدمی تھے۔ مگر ایسی باتیں سُنکر آبدیدہ ہو جاتے۔ ذرا ذرا دیر میں سوسیلا پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ پھر چونکتی تو اِدھر اُدھر وحشت آمیز نگاہیں ڈالکر پوچھنے لگتی۔ وہ کہاں گئے ؟ کیا چھوڑ کر چلے گئے۔ بعض اوقات نسیان کا اتنا غلبہ ہو جاتا کہ منشی جی بار بار کہتے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ گھبراو نہیں۔ مگر اُسے یقین نہ آتا۔ انھیں کی طرف تکتی اور پوچھتی کہاں ہیں۔ یہاں تو نہیں ہیں۔ کہاں چلے گئے

ذرا دیر میں جب ہوش آجاتا تو خاموش ہو جاتی - اور رونے لگتی - تینوں دن اُسنے برجن - سُبا ما - پرتاپ ان تینوں میں سے ایک کی بھی یاد نہ کی وہ سب کے سب ہر دم اُسکے پاس کھڑے رہتے - مگر ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بجز منشی جی کے اور کسی کو پہچانتی ہی نہیں - جب برجن بہت بیقرار ہو جاتی - اور اُسکے گلے میں ہاتھ ڈالکر رونے لگتی تو وہ ذرا آنکھیں کھولدیتی اور پوچھتی کون ہے برجن ؟ ہوں - بس اور کچھ نہ پوچھتی - جیسے بخیل کے دل میں مرنے کے وقت سوائے اپنے دفینہ کے اور کسی بات کا دھیان نہیں رہتا - اُسی طرح ہندو عورت اپنے آخری لمحوں میں سوائے اپنے پتی کے اور کسی کا دھیان نہیں کر سکتی - کیونکہ بخیل کو اپنی دولت سے جتنی محبت ہے اُس سے بہت زیادہ بدرجہا محبت پتی برتا عورت کو اپنے شوہر سے ہوتی ہے -

کبھی کبھی سوسیلا یکایک چونک پڑتی اور ہکا بکا کر پوچھتی ارے یہ کون کھڑا ہے - یہ کون بھاگا جا رہا ہے - انھیں کیوں لئے جاتا ہے - نہ - میں نہ جانے دونگی - یہ کہکر منشی جی کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ لیتی - ایک لمحہ میں جب ذرا بیخودی دور ہوتی تب تم سے کہتی میں سپنا دیکھ رہی تھی - جیسے کوئی تمھیں لئے جاتا تھا - دیکھو تمھیں ہماری قسم - جانا نہیں نہیں معلوم کہاں لیجائیگا - پھر تمھیں کیسے دیکھونگی - ایں ! منشی جی کا کلیجہ مسوسنے لگتا - اُسکی طرف نہایت محبت آمیز - شفقت اور درد سے بھری ہوئی نگاہ ڈالکر بولتے نہیں - میں نہ جاؤنگا - تمھیں چھوڑکر کہاں جاؤنگا - سبا ما اُسکی حالت دیکھتی اور روتی کہ اب یہ کچھ دیر کی اور مہمان ہیں - ضرورت نے اُسکی شرم و حیا سب دور کر دی تھی - منشی جی کے سامنے گھنٹوں بے حجاب کھڑی رہتی -

چوتھے دن سوسیلا کی حالت سنبھل گئی - منشی جی کو یقین ہو گیا کہ بس یہ آخری فیصلہ ہے

چراغ گل ہونے سے پہلے بھبک اُٹھتا ہے۔ سویرے ہی جب ہاتھ مُنہ دھو کر گھر میں
آئے تو سوسیلا نے انھیں اشارے سے اپنے قریب بُلایا۔ اور بولی کہ مجھے اپنے ہاتھ
سے تھوڑا سا پانی پلا دو۔ آج اُس پر نسیان کا غلبہ بہت کم معلوم ہوتا تھا۔ اُسنے برجن۔
سُباما۔ پرتاپ سب کو بخوبی پہچانا۔ اور برجن کو بڑی دیر تک چھاتی سے لگائے روتی رہی۔
جب پانی پی چکی تو سُباما سے کہا بہن ذرا ہمکو اُٹھا کر بٹھا دو۔ سوامی جی کے پیر چھو لوں۔ پھر
نہ جانے کب ان چرنوں کے درشن ہونگے۔ سُباما نے روتے ہوئے اُسے ہاتھوں کے
سہارے ذرا سا اُٹھا دیا۔ پرتاپ اور برجن سامنے کھڑے تھے۔ سوسیلا نے منشی جی سے
کہا ذرا نزدیک آجاؤ۔ منشی جی اسوقت فرط محبت و درد سے بیخود ہوکر اُسکے سینہ سے لپٹ گئے
اور روتے ہوئے بولے تم گھبراؤ نہیں۔ ایشور چاہے گا تو تم اچھی ہو جاؤ گی۔ سوسیلا نے
مایوسانہ انداز سے مسکرا کر کہا ہاں آج اچھی ہو جاؤنگی۔ ذرا اپنا پیر بڑھا دو۔ میں چوم لوں۔
منشی جی ہچکچاتے رہے۔ اِسوقت سُباما پہلی بار اُنسے روتے ہوئے بولی۔ پیر بڑھا دیجئے۔
اِنکے دل کی آرزو بھی نکل جائے۔ تب منشی جی نے پیر بڑھا دیا۔ سوسیلا نے اُسے دونوں
ہاتھوں سے پکڑ کر کئی بار چوما۔ اور تب انپر ہاتھ رکھکر رونے لگی۔ اور دم کی دم میں دونوں
پیر گرم قطروں سے تر ہو گئے۔ پتی برتا عورت نے پریم کے موتی شوہر کے قدموں پر
نثار کر دیئے۔

جب ذرا آواز قابو میں ہوئی تو اُسنے برجن کا ایک ہاتھ پکڑ منشی جی کے ہاتھ میں دیا۔
اور نہایت دھیمی آواز میں بولی "سوامی جی۔ آپ کے ساتھ بہت دن رہی۔ اور زندگی کا
بہت سُکھ اُٹھایا۔ اب پریم کا ناتا ٹوٹتا ہے۔ اب میں دم بھر کی اور مہمان ہوں۔ پیاری
برجن کو تمھیں سونپے جاتی ہوں۔ میری یہی نشانی ہے۔ اُسپر ہمیشہ مہربانی کی نگاہ رکھنا

میری قسمت میں اپنی پیاری بچی کا سکھ دیکھنا نہ لکھا تھا۔ اُسے مینے کبھی کوئی کڑی بات
نہیں کہی کبھی کڑی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ یہ میری زندگی کا پھل ہے۔ ایشور کے لئے
تم اُسکی طرف سے بے سُدھ نہو جانا۔ یہ کہتے کہتے ہچکیاں بندھ گیئں۔ اور غشی سی آگئی۔

جب ذرا پھر افاقہ ہوا تو اُسنے سُبا ما کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے اور رو کر بولی
"بہن برجن تمہارے سپرد ہے۔ تم اُسکی ماں کی جگہہ ہو۔ للو! پیارے۔ ایشور کرے تم
جُگ جُگ جیو۔ اپنی برجن کو بھولنا مت۔ وہ تمہاری غریب بے ماں کی بہن ہے۔ تم میں
اُسکی جان بستی ہے۔ اُسے رولانا مت۔ اُسے کُڑھانا مت۔ اُسے کبھی کڑی بات مت
کہنا۔ اُس سے کبھی نہ روٹھنا۔ اُسکی طرف سے بیخبر نہونا۔ نہیں تو وہ رو رو کر جان دیدیگی۔
اُسکے بھاگ میں نہ جانے کیا بدا ہے۔ مگر تم اُسے اپنی سگی بہن سمجھکر سدا اُسکی دلجوئی کرتے رہنا۔
میں ذرا دیر میں تم لوگوں کو چھوڑکر چلی جاؤنگی۔ مگر تمھیں میری قسم۔ اُسکی طرف سے من موٹا
نکرنا۔ تم نے اور تمہاری ماں نے اُسے آدمی بنایا ہے۔ اور تمھیں اُسکا بیڑا پار لگاؤ گے۔
میرے دل میں بڑے بڑے ارمان تھے۔ میری لالسا تھی کہ تمہارا بیاہ کرونگی۔ تمہارے
بچے کھلاؤنگی۔ مگر بھاگ میں کچھ اور ہی بدا تھا"

یہہ کہتے کہتے پھر بیہوشی اور نقاہت نے اُسپر غلبہ کیا۔ سارا گھر رو رہا تھا۔ مہریاں۔
مہراجنیں۔ نوکر چاکر سب اُسکا جس گا رہے تھے۔ عورت نہیں دیوی تھی۔
بڑھیا "اتنے دن ٹہل کرتے ہوئے مگر کبھی کڑی بات نہیں کہی"
مہراجن "ہمکو بیٹی کی طرح مانتی تھیں۔ کھانا کیسا ہی پکا کے رکھدوں۔ مگر کبھی نراض نہیں
ہوئیں۔ جب بات کرتیں مُسکرا کے۔ مہراج جب آتے تو اُنھیں ضرور سیدھا دلواتی تھیں"
اسی طرح کی باتیں سب کر رہے تھے۔ دوپہر کا وقت آیا۔ مہراجن نے کھانا بنایا مگر

کھاتا کون۔ منشی جی بڑے اصرار سے گئے اور مُنہ جھوٹا کر کے چلے آئے پرتاپ نے وہاں سے ٹلنے کی قسم کھالی تھی۔ برجن اور سُباما کو بھوک کہاں۔ سوسیلا کبھی برجن کو پیار کرتی کبھی سُباما کو گلے لگاتی۔ کبھی پرتاپ کو چومتی اور کبھی اپنی بیتی کہہ کے روتی۔ سہ پہر کو وقت اُسنے سب نوکروں کو بلوایا۔ اور اُنکے خطا معاف کروائی۔ جب یہ سب چلے گئے تو سوسیلا سُباما سے بولی بہن پیاس بہت لگتی ہے۔ اُنسے کہہ دو ذرا اپنے ہاتھ سے پھر پانی پلادیں۔ منشی جی پانی لائے اور سوسیلا نے ایک گھونٹ بمشکل تمام حلق کے نیچے اُتارا۔ اور ایسا معلوم ہوا گویا اُسے کسی نے امرت پلادیا۔ اسکا چہرہ روشن ہوگیا۔ آنکھوں میں رس بھر آیا۔ شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈالکر بولی "میں کیسی بھاگوان ہوں کہ تمہارے گود میں مرتی ہوں" یہ کہکر وہ چپ ہوگئی۔ جیسے کوئی بات کہنی چاہتی ہے۔ اور لحاظ سے نہیں کہتی۔ تھوڑی دیر کے بعد اسنے پھر منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "اگر تم سے کچھ مانگوں تو دوگے؟"

منشی جی نے متعجب ہوکر کہا "تمہارے لئے مانگنے کی ضرورت ہے؟ شوق سے کہو۔"

سوسیلا "تم میری بات کبھی نہیں ٹالتے تھے۔"

منشی جی "مرتے دم تک کبھی نہ ٹالونگا۔"

سوسیلا "ڈر لگتا ہے۔ کہیں نہ مانو تو۔ . . ."

منشی جی "تمہاری بات اور میں نہ مانوں۔"

سوسیلا "میں تمکو نہ چھوڑونگی۔ ایک بات بتلادو۔ سِلی مرجائیگی تو اُسے بھول جاؤگے؟"

منشی جی "ایسی باتیں نہ کرو۔ دیکھو برجن روتی ہے۔"

سوسیلا "بتلادو مجھے بھولوگے تو نہیں۔"

منشی جی "۔ تمہاری یاد مرتے دم تک تازہ رہیگی"

سوسیلا نے اپنے مُرجھائے رخسارے منشی جی کے ہونٹوں پر رکھدیئے۔ اور دونوں باہیں اُنکے گلے میں ڈالدیں۔ پھر برجن کو قریب بلا کے آہستہ آہستہ سمجھانے لگی دیکھو بیٹا۔ لالہ جی کا کہنا ہردم ماننا۔ اُنکی سیوا خوب من لگاکر کرنا۔ گھر کا سارا بوجھ اب تمہارے ہی اوپر ہے۔ اب تمہارے سوائے کون سنبھالیگا"

یہہ کہکر اُسنے شوہر کی طرف دردآمیز نگاہوں سے دیکھکر کہا "میں اپنے من کی بات نہیں کہنے پائی۔ جی ڈوبا جاتا ہے"

منشی جی "تم ناحق پس وپیش کرتی ہو"

سوسیلا "تم میرے ہوکر نہیں"

منشی جی "تمہارا اور مرتے دم تک تمہارا"

سوسیلا "ایسا نہو کہ مجھے بھولجاؤ۔ اور جو چیز میری تھی وہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے"

منشی جی (اشارہ سمجھکر) "اسکا ذکر ہی کیوں کرتی ہو۔ جب تک جیونگا تمہارا ہی رہونگا"

سوسیلا نے برجن کو پھر بلایا اور باپ کے قدموں پر گرا دیا۔ اور مارے ضعف کے بیدم ہوگئی۔ برجن اور پرتاپ رونے لگے۔ سُباما نے بھی سمجھا کر ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ گیا۔ منشی جی نے کانپتے ہوے سوسیلا کے سینہ پر ہاتھ رکھا۔ سانس دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ مہراجن کو بلاکر کہا اب انھیں زمین پر لٹا دو۔ یہہ کہتے ہوئے بے اختیار رونے لگے۔ مہراجن اور سُباما نے ملکر سوسیلا کو زمین پر لٹا دیا۔ تپ دق نے ہڈیاں تک سکھا ڈالی تھیں۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔ سارے کمرہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا حسرتناک سناٹا۔ وحشتناک سناٹا

وہ سناٹا جو دلونکو ملول اور متفکر بنا دیتا ہے۔ رونیوالے روتے تھے۔ مگر گلا دبا کر باتیں ہوتی تھیں۔ مگر دبی آوازوں میں۔ سوسیلا زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ تن نازک جو کبھی ماں کے گود میں پلا۔ کبھی محبت کے آغوش میں لیٹا۔ کبھی پھولوں کے سیج پر سویا اسوقت زمین پر پڑا ہوا تھا۔ ابھی تک نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ منشی جی فرط الم و یاس سے خاموش اسکے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتہً سوسیلا کے اعضا میں حرکت پیدا ہوئی۔ اُسنے سر اُٹھا دیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے منشی جی کا پیر پکڑ لیا۔ اور روح پرواز کر گئی۔ دونوں ہاتھ اُنکے پیر و نکا حلقہ کیئے ہی رہ گئے۔ یہہ زندگی کا آخری کام تھا۔

رونیوالو! روؤ کیونکہ سوائے رونے کے اور تم کر ہی کیا سکتے ہو۔ تمھیں اسوقت کوئی کتنا ہی سمجھائے۔ مگر تمہاری آنکھیں آنسو کی باڑھ کو نہ روک سکینگی۔ رونا تمہارا فرض ہے۔ زندگی میں رونے کے موقعے شاذ ہی ملتے ہیں۔ کیا اس موقع پر تمہاری آنکھیں بخل کر جائینگی۔ آنسوؤں کے تار بندھے ہوئے تھے۔ سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں کہ مہراجن چراغ جلا کر کمرہ میں لائی۔ ذرا دیر پہلے سوسیلا کی زندگی کا چراغ بجھ چکا تھا۔

بارھویں فصل

برجن کی رخصتی
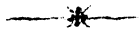
راد ھاچرن رُڑکی کالج سے نکلتے ہی مراد آباد کے انجنیر مقرر ہوگئے۔ اور چندرا اُنکے ساتھ مراد آباد کو چلی۔ پریموتی نے بہت روکنا چاہا۔ مگر جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔ سیوتی کب کی سسرال جاچکی تھی۔ یہاں گھر میں اکیلی پریموتی رہ گئی اُسکے سر گھر کا کام کاج۔ آخر یہہ رائے ہوئی کہ برجن کی رخصتی کا پیغام دیا جائے۔ ڈپٹی صاحب رخصتی کے سخت برخلاف تھے۔ مگر گھر کے معاملات میں پریموتی کا حکم قطعی ہوتا تھا۔

سجیون لال نے پیغام منظور کرلیا۔ کچھ دنوں سے وہ تیرتھ جاترا کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سوسیلا کے مرنے کے بعد رفتہ رفتہ انھوں نے تمام دنیاوی تعلقات ترک کر دیئے تھے۔ دن بھر کمرہ میں آسن مارے بھگوت گیتا اور یوگ بششٹ اور دوسری معرفت کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ شام ہوتے ہی گنگا اشنان کو چلے جاتے۔ وہاں سے رات گئے لوٹے۔ اور دو چار لقمے کھاکر سو جاتے۔ اکثر پرتاپ چندر بھی اُنکے ساتھ گنگا اشنان کو جاتا۔ اور اگرچہ پورے سولہ سال کا بھی نہوا تھا مگر مناسبت فطری کہو۔ یا ورثہ پدری۔ یا فیض صحبت کہ ابھی سے اُسے اسرار معرفت پر غور وخوض کرنے میں بیحد لطف حاصل ہوتا۔ گیان اور حقیقت کے تذکرے سنتے سنتے اسکا رجحان بھی بھگتی کی جانب ہو چلا تھا۔ اور بعض اوقات منشی جی سے ایسے دقیق مسائل پر

بحث کرتا کہ وہ حیرت میں آجاتے۔

برج رانی پر سُبا ما کی تعلیم کا اُس سے بھی گہرا اثر پڑا تھا جتنا پرتاپ چندر پر منشی جی کی صحبت اور تعلیم کا۔ اُسکا پندرھواں سال تھا جو ہمارے یہاں شباب کی پہلی منزل سمجھی جاتی ہے۔ اس سِن میں لڑکیوں پر شوق سنگار کا جنون سوار ہوتا ہے۔ اُنکے انداز اور طریق میں بجائے طفلانہ شوخی کے ایک متانت آمیز چلبلا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ دلوں میں شباب کی اُمنگیں لہریں مارنے لگتی ہیں۔ اور نگاہوں سے بجائے سادگی اور شوخی کے ایک جذبہ آمیز رسیلا پن برسنے لگتا ہے۔ مگر برج رانی ابھی تک وہی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اُسکا چہرہ معصومیت کی تصویر تھا۔ ایک ایک انداز سے سادگی ٹپکتی تھی۔ ہاں رفتار میں ایک دلآویز دھیرا پن اور طرز کلام میں لُبھانے والی شیرینی پیدا ہو گئی تھی۔ اُسکی باتیں سُننے والے پر موہنی منتر پڑھ دیتی تھیں۔ مُنہ اندھیرے اُٹھتی۔ اور سب سے پہلے منشی جی کا کمرہ صاف کر کے اُنکے پوجا پاٹ کا سامان قرینہ سے رکھ دیتی۔ پھر گھر کے دھندے میں لگ جاتی دوپہر کا وقت اُسکے لکھنے پڑھنے کا تھا۔ سُبا ما سے اُسے جتنی محبت اور عقیدت تھی اتنی شاید اپنی ماں سے بھی نہ رہی ہو۔ اُسکی مرضی برجن کے لئے قانون تھی۔

سُبا ما کی تو صلاح تھی کہ ابھی رخصتی نہ کی جائے۔ مگر منشی جی مصر ہوئے اور بدائی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جوں جوں وہ مصیبت کی گھڑی سر پر آتی۔ برجن کی بیقراری بڑھتی جاتی تھی۔ رات دن رویا کرتی۔ کبھی باپ کے پیروں پڑتی۔ کبھی سُبا ما کے پیروں سے لپٹ جاتی۔ مگر بیاہی لڑکی پرائے گھر کی ہو جاتی ہے۔ اُسپر کسی کا کیا اختیار۔ پرتاپ چندر اور برجن کتنے دنوں تک بھائی بہنوں کی طرح ایک ساتھ

مگر اب برجن کی آنکھیں اُسے دیکھتے ہی نیچے کو جھک جاتیں۔ پرتاپ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ گھر میں بہت کم آتا۔ یا کسی ضرورت سے آتا تو کچھ اسطرح نگاہیں نیچے کئے۔ اور سمٹا ہوا گویا دولہن ہے۔ اُسکی اِن نگاہوں میں وہ رازِ محبت چھپا ہوا تھا جسے وہ کسی متنفس۔ حتیٰ کہ برجن پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ رخصتی کو صرف تین دن رہ گئے تھے۔ پرتاپ کسی ضرورت سے اندر گیا اور اپنے کمرہ میں لیمپ جلانے لگا کہ برجن آئی۔ اُسکا آنچل آنسوؤں سے تر تھا۔ اُسنے آج دو برس کے بعد پرتاپ کی طرف پُرآب آنکھوں سے دیکھکر کہا "للّو مجھ سے کیسے صبر ہوگا!"

پرتاپ نے مردانہ ضبط سے کام لیا۔ اُسکی آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ اُسکی آواز بھاری ہوگئی۔ واعظانہ لہجہ میں بولا۔ "ایشور تمھیں صبر کی طاقت دیگا۔"

برجن کی گردن جھک گئی۔ آنکھیں زمین میں گڑ گئیں۔ اور ایک دبی ہوئی سسکی نے حسرت و درد کا وہ دفتر بیان کر دیا جو زبان سے ناممکن تھا۔

رخصتی کا دن لڑکیوں کے لئے عجیب حسرت کا دن ہوتا ہے۔ بچپن کی سکھیاں۔ سہیلیاں۔ ماں باپ۔ بھائی بند۔ گھر کے مانوس در و دیوار اِن سب سے ناتا ٹوٹ جاتا ہے۔ یہہ خیال کہ میں پھر اس گھر میں آؤنگی اُسے مطلق تسکین نہیں دیتا۔ کیونکہ اب وہ آئیگی تو مہمان کی حیثیت سے آئیگی۔ اُن لوگوں سے جدا ہونا جنکے درمیان زندگی کے گہوارے میں کھیلنا اور بیفکریوں کے چمن میں سیر کرنا نصیب ہوا ہو اُسکے جگر کے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ابتک وہ دنیا کے اور پابندیوں سے آزاد رہتی ہے۔ مگر آج سے اسکے سر پر ایسا بوجھ لدتا ہے جو مرتے دم تک اُٹھانا پڑیگا۔

برجن کا سنگار کیا جا رہا تھا۔ نائن اُسکے پیروں میں مہاور رچا رہی تھی۔ کوئی اُسکے سر کے بال گوندھ رہی تھی۔ کوئی جوڑے میں عطر بسا رہی تھی۔ مگر جسکے لئے یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں وہ زمین پر موتی کے دانے یوں بکھیر رہی تھی گویا اُنکا کچھ مول نہیں ہے۔ اتنے میں باہر سے پیغام آیا ساعت ٹلی جا رہی ہے۔ جلدی کرو۔ سُبا ما پاس کھڑی تھی۔ برجن اُسکے گلے لپٹ گئی۔ اور وہ جوش گریہ جو اب تک دبی ہوئی آگ کی طرح سُلگ رہا تھا یکبارگی یوں ابل پڑا جیسے کوئی آنچ میں تیل ڈالدے۔

ذرا دیر میں پالکی دروازہ پر آئی۔ برجن پاس پڑوس کی عورتوں سے گلے ملی۔ سُبا ما کے پیر چھوئے۔ اور تب دو تین عورتوں نے اُسے پالکی کے اندر بٹھا دیا۔ اُدھر پالکی اُٹھی۔ اِدھر سُبا ما غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ گویا اُسکے جیتے جی کوئی اُسکی جان نکالکر لئے جاتا تھا گھر سونا ہو گیا۔ سیکڑوں عورتوں کا جمگھٹ تھا۔ مگر ایک برجن کے نہونے سے مکان پھاڑے کھاتا تھا۔
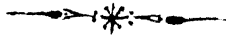
تیرھویں فصل

کملا چرن کے دوست

جیسے سیندور کی سرخی سے مانگ سج جاتی ہے اُسی طرح برج رانی کے آنے سے
پریمونتی کے گھر کی رونق دوبالا ہو گئی۔ سُباما نے اُسے ایسے گُن سکھائے تھے کہ جسنے
اُسے دیکھا موہ گیا۔ یہانتک کہ سیوتی کی سہیلی رانی کو بھی پریمونتی کے سامنے اقرار کرنا پڑا
کہ تمہاری چھوٹی بہو نے تو ہم سبھوں کا رنگ پھیکا کر دیا۔ سیوتی اُس سے دن دن بھر
باتیں کرتی اور اُسکا جی نہ بھرتا۔ اُسے اپنے گانے پر ناز تھا۔ مگر اس میدان میں بھی برجن
بازی لیگئی۔

اب کملا چرن کے دوستوں نے تقاضا کرنا شروع کیا کہ بھئی نئی دولہن گھر میں لائے ہو۔
کچھ دعوت جلسہ کی بھی فکر ہے۔ سُنتے ہیں نہایت حسین بیوی پائی ہے۔ کملا چرن کو روپیہ
تو سسرال میں ملا ہی تھا۔ جیب کھنکھنا کر بولے اجی دعوت لو۔ شرابیں اُڑاؤ۔ انگیس سنگیو۔
ل بہت ہو حق نہ مچانا۔ ورنہ کہیں اندر خبر ہو تو سمجھیں یہ شہدا ہے۔ جب سے وہ گھر میں
آئی ہیں ایجناب کا قافیہ تنگ ہے۔ سنتا ہوں انگریزی۔ فارسی۔ سنسکرت الم غلم سب گھوٹے
بیٹھی ہوئی ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں انگریزی میں پوچھ بیٹھی تو۔ یا فارسی میں بات چیت شروع
کر دی تو۔ سوائے بغلیں جھانکنے کے اور کیا کرونگا۔ اسلئے ابھی کنی کاٹتا پھرتا ہوں۔

یوں تو کملا چرن کے دوستوں کی تعداد لا محدود تھی۔ شہر کے جتنے کبوتر باز۔

کنکوے باز۔ شہدے تھے سب انکے دوست تھے۔ مگر دلی دوستوں میں صرف پانچ آدمی تھے اور سب کے سب فاقہ مست۔ آوارہ۔ انہیں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ میاں مجید تھے۔ کچہری میں عرائض نویسی کیا کرتے تھے۔ جو کچھ ملتا وہ سب شراب کے نذر کرتے۔ دوسرا نمبر حمید خاں کا تھا۔ ان ذات شریف نے ورثہ میں بڑی دولت پائی تھی۔ مگر تین سالوں میں سب کچھ ارباب نشاط کے نذر کر دیا۔ اب یہہ وتیرہ تھا کہ شام کو سج دھج بنا کر گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے۔ اور وقت ضرورت پر بازار حُسن کی دلالی بھی کیا کرتے تھے۔ اس بازار کے خریداروں اور بیوپاریوں میں اُنکی بڑی رسائی تھی۔ تیسرے حضرت سعید حسین تھے۔ ایک ہی شاطر قمار باز۔ سینکڑوں کے داؤں لگانیوالے۔ بیوی کے زیوروں پر ہاتھہ صاف کرنا روزمرّہ کا مشغلہ تھا۔ باقی دو صاحب رام سیوک اور چند ولال کچہری میں ملازم تھے۔ تنخواہیں تھوڑی۔ مگر بالائی رقم وافر۔ نصف شراب کے نذر کرتے۔ اور نصف شاہدان حُسن فروش کی خاطر مدارات میں صرف ہوتی۔ گھر کے لوگ فاقے کرتے۔ یا بھیک مانگتے۔ انھیں صرف اپنے عیش سے کام تھا۔

مشورہ تو ہو ہی چکا تھا۔ آٹھ بجے جب ڈپٹی صاحب لیٹے تو یہہ پانچوں حضرات جمع ہوئے اور دور چلنے لگا۔ پانچوں پینے میں حاتم تھے۔ دائم الخمر۔ جب ذرا سرور گٹھا تو بہکی بہکی باتیں ہونے لگیں۔

مجید "کیوں بھئی کملا چرن! سچ کہنا دیکھکر جی خوش ہو گیا یا نہیں؟"

کملا "اب آپ بہکنے لگے کیوں؟"

رام سیوک "بتلا کیوں نہیں دیتے۔ اسمیں چھپنے کی کیا بات ہے"

کملا "بتلا کیا اپنا سر دوں۔ کبھی سامنے جانیکا اتفاق بھی تو ہو۔ ہو کل کواڑ کی دراڑ سے

ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ ابھی تک تصویر نگاہوں میں پھر رہی ہے۔"

چندولال "میرے یار تو بڑا بلند اقبال ہے۔"

کملا "ایسا بیقرار ہوا گرتے گرتے بچا۔ بس پری سمجھ لو۔

مجید "تو بھئی یہ دوستی کس دن کام آئیگی۔ ایک نظر ہمیں بھی دکھاؤ۔"

سعید "بیشک دوستی کے یہی معنی ہیں کہ آپس میں کوئی پردہ نہ رہے۔ دوئی کا مسئلہ بے القط ہو جائے۔"

چندولال - دوستی میں کیا پردہ انگریزوں کو دیکھو۔ بیوی ڈولی سے اُتری نہیں کہ یار دوست ہاتھ ملانے لگے۔"

رام سیوک "مجھے تو بن دیکھے چین نہ آئیگا۔ ہیں تو پختہ۔"

کملا - (ایک دھول لگاکر) "زبان کاٹ لی جائیگی سمجھے۔"

رام سیوک "کچھ پرواہ نہیں۔ آنکھیں تو دیکھنے کو رہینگی۔"

مجید "بھئی کملا چرن بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ اب اسوقت تمہارا فرض ہے کہ دوستوں کی فرمایش پوری کرو۔"

کملا "ارے تو میں انکار کب کرتا ہوں۔"

چندولال "واہ میرے شیر۔ یہ مردوں کی سی باتیں ہیں۔ تو ہم لوگ بن ٹھن کر آجائیں کیوں؟"

کملا "جی ذرا منہ میں کالکھ لگا لیجیگا۔ بس اتنا کافی ہے۔"

سعید "تو کار خیر میں تاخیر کیوں ہو۔ آج ہی کی ٹھیری نہ۔"

کملا "آج ہی سہی۔ مگر یاد رہے کل آپ سب اصحاب کی بیویوں کی درشن کرونگا۔ اسوقت اگر کسی نے چیں چپڑ کیا تو بندہ کا پاپوش مبارک ہوگا اور اُسکا فرق نامبارک۔"

سب کے سب "منظور بدل و جان منظور"

رام سیوک "یہاں کیا دھرا ہے۔ پانچ بچوں کی ماں۔ اُس پر چھٹے حال خامی چڑیا ہو رہی ہے"

چندو لال "یہاں اُس سے بھی بدتر حال ہے۔ تین مہینہ سے چوتھیا آرہا ہے۔ مگر کس مردود نے ایک کوڑی کی بھی دوائی ہو۔ صورت دیکھتے ہی بخار چڑھ آتا ہے"

سعید "اینجانب یہ روگ ہی نہیں پالتے ہیں۔ چند روزہ انتظام مستقل انتظام سے بہتر ہوتا ہے"

ادھر تو ہے تاب کے دور چل رہے تھے۔ اُدھر برجن پلنگ پر لیٹی ہوئی خیالوں میں غرق تھی۔ بچپن کے دن کیسے اچھے ہوتے ہیں۔ کاش وہ دن پھر آجاتے آہا کیسی عجیب زندگی تھی۔ دنیا ناز۔ پیار اور محبت کا گہوارہ تھی۔ کیا وہ کوئی دوسری دنیا تھی۔ کیا اُن دنوں دنیا کی چیزیں بہت خوبصورت ہوتی تھیں۔ انھیں خیالوں میں آنکھ ذرا جھپک گئی۔ اور بچپن کا ایک واقعہ پیش نظر ہو گیا۔ للو نے اُسکی گڑیا مروڑ دی۔ اُسنے اُسکی کتاب کے دو ورق پھاڑ ڈالے۔ تب للو نے اُسکی پیٹھ میں زور سے چٹکی لی۔ اور باہر بھاگا۔ وہ رونے لگی اور للو کو کوس رہی تھی کہ سُباما اُسکا ہاتھ پکڑے ہوئے آئی اور بولی "کیوں بیٹی اُسنے تمھیں مارا ہے نہ۔ یہ بہت مار مار کر بھاگتے ہیں۔ آج انکی مرمت کرتی ہوں۔ دیکھیں کہاں مارا ہے" للو نے ڈبڈبائی آنکھوں سے برجن کی طرف دیکھا۔ اور برجن نے مسکرا کر کہا "مجھے انھوں نے کہاں مارا۔ یہ مجھے کبھی نہیں مارتے" یہ کہکر اُسکا ہاتھ پکڑ لیا۔ اپنے حصہ کی مٹھائی کھلائی۔ اور پھر دونوں ملکر کھیلنے لگے۔ وہ زمانہ اب کہاں؟ اس زمانہ کی یاد ایک خواب حسرت کی یاد ہے۔

رات زیادہ گذر گئی تھی یکایک برجن کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی سامنے والی دیوار سے دھمکا رہا ہے۔ اُسنے کان لگا کر سُنا۔ برابر آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی رُک جاتیں۔ پھر آنے لگتیں

ذرا دیر میں مٹی گرنے لگی۔ خوف کے مارے برجن کے ہاتھ پانوں پھول گئے۔ کلیجہ دھک
دھک کرنے لگا۔ جی کڑا کر کے اُٹھی۔ اور مہراجن کو جھنجھوڑنے لگی۔ گھگھی بندھی ہوئی تھی۔
اتنے میں مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا سامنے گرا۔ اور مہراجن چونکر اُٹھ بیٹھی۔ دونوں کو یقین ہو گیا
کہ چور آئے ہیں۔ مہراجن ایک ہی چالاک عورت تھی سمجھی کہ چلّاؤنگی تو جاگ ہو جائیگی۔ اُسنے
سن رکھا تھا کہ چور پہلے سیند میں پیر ڈالکر دیکھتے ہیں۔ تب خود گھستے ہیں۔ اُسنے ایک ڈنڈا اُٹھا لیا
کہ جب پیر ڈالیگا تو ایسا تاک کر مارونگی کہ ٹانگ ٹوٹ جائیگی۔ مگر چور نے پیر کے بجائے سیند میں
سے سر باہر نکالا۔ مہراجن تاک میں تو تھی ہی۔ ڈنڈا چلا دیا۔ اور کھٹ کی آواز آئی۔ چور نے
فوراً سر کھینچ لیا۔ اور یہ کہتا ہوا سنائی دیا۔ "اُف! مار ڈالا۔ کھوپڑی بھنا گئی۔" پھر کئی
آدمیوں کے بھننے کی آواز آئی۔ اور اسکے بعد سناٹا ہو گیا۔ اتنے میں اور لوگ جاگ پڑے۔
اور باقی رات گپ شپ میں کٹی۔

سویرے جب کملا چرن گھر میں آئے تو آنکھیں سُرخ تھیں۔ اور سر میں آماس تھا۔
مہراجن نے نزدیک جا کر دیکھا اور تب آکر برجن سے بولی بہو ایک بات کہوں۔ بُرا تو نہ مانوگی؟

برجن: "بُرا کیوں مانونگی۔ کہو کیا کہتی ہو۔"

مہراجن: "رات جو سیند پڑی تھی وہ چوروں نے نہیں لگائی تھی۔"

برجن: "پھر کون تھا؟"

مہراجن: "گھر ہی کے بھیدی تھے۔ باہری کوئی نہیں تھا۔"

برجن: "کیا کسی کہار کی شرارت تھی؟"

مہراجن: "نہیں۔ کہاروں میں ایسا کوئی نہیں ہے۔"

برجن: "پھر کون تھا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں۔"

مہراجن ۔ "میری جان وہ تو چھوٹے بابو تھے ۔ میں نے وہ لکڑی نہیں پھینکی تھی ۔
وہ اُنکے سر میں لگی ۔ سر پھولا ہوا ہے"

اتنا سنتے ہی برجن کے تیور بدل گئے ۔ اور چہرہ تمتما گیا ۔ غضبناک ہو کر بولی "مہراجن!
ہوش سنبھالکر باتیں کرو ۔ تمھیں یہہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی ۔ تمھیں میرے سامنے
ایسی بات کہنے کا حوصلہ ہوا ؟ خود میرے سر پر الزام ٹھونک رہی ہو ۔ تمھارے بڑھاپے
پر ترس آتا ہے ۔ ورنہ اسیوقت تمھیں یہاں سے کھڑے کھڑے نکلوا دیتی ۔ تب تمھیں
معلوم ہوتا کہ زبان کو قابو میں نہ رکھنے کا یہہ پھل ہوتا ہے ۔ یہاں سے اُٹھ جاؤ ۔ مجھے
تمھاری صورت دیکھکر بخار سا چڑھ رہا ہے ۔ تمھیں اتنا نہ سمجھ پڑا کہ میں کیسی بات زبان سے
نکال رہی ہوں ۔ اُنھیں ایشور نے کیا نہیں دیا ہے ۔ سارا گھر اُنکا ہے ۔ میرا جو کچھ ہے
اُنکا ہے ۔ میں خود اُنکی چیری ہوں ۔ اور اُنکی نسبت تم ایسی بات کہہ بیٹھیں"

مگر جس بات پر برجن ایسی برہم ہوئی اُسی بات پر گھر کے دوسرے آدمیونکو آسانی سے
یقین آگیا ۔ ڈپٹی صاحب کے کان میں بھی بات پہونچی ۔ وہ کملا چرن کو اُس سے زیادہ
شریر النفس سمجھتے تھے جتنا وہ فی الواقع تھا ۔ خوف ہوا کہ کہیں یہہ حضرت بہو کے زیوروں
پر نہ ہاتھ صاف کریں ۔ بہتر ہے کہ انھیں بورڈنگ ہاؤس بھیجدوں ۔ کملا چرن نے یہہ
تجویز سُنی تو بہت چیخے ۔ چلاّئے ۔ مگر کچھ سوچکر دوسرے دن بورڈنگ ہاؤس چلے گئے
برجن کے آنے سے پہلے کئی بار یہہ تجویز ہوئی تھی ۔ مگر کملا کی ضد کے سامنے ایک بھی
پیش نہ گئی تھی ۔ یہہ بیوی کے نگاہوں میں ذلیل ہو جانے کا خوف تھا جو اب کی بار اُسے
بورڈنگ ہاؤس لیگیا ۔

—— ✤ ——

چودھویں فصل

کایا پلٹ
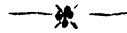
پہلا دن تو کملا چرن نے کسی طرح بورڈنگ ہاؤس میں کاٹا صبح سے شام تک پڑے سویا کئے - دوسرے دن خیال آیا کہ آج تو نواب صاحب اور تیکھے مرزا کے بٹروں میں بدا ہوا جوڑ ہے کیسے کیسے مست پٹھے ہیں کہ دیکھکر روح وجد کرنے لگے - آج انکی پکڑ دیکھنے کے قابل ہوگی - شہر کا شہر پھٹ پڑے تو تعجب نہیں - چہ خوش - شہر کے لوگ تو بہاریں اڑائیں - اور میں یہاں کتابوں سے سر لڑاؤں - یہ سوچتے سوچتے اُٹھا - اور دم کی دم میں بدان کے موقعہ پر تھا -

یہاں آج خلقت کی خلقت جمع تھی خاصہ میلہ لگا ہوا تھا - سقے چھڑکاؤ کر رہے تھے - سگرٹ والے کباب والے - تنبولی سب اپنی اپنی دوکانیں لگائے بیٹھے تھے - اور شہر کے رنگین مزاج نوجوان - ہاتھوں میں بٹیر لئے یا تھلی اڈوں پر بلبلوں کو بٹھائے مٹر گشت کر رہے تھے - کملا چرن کے دوستوں کی اس جگہ کیا کمی لوگ انھیں خالی ہاتھ دیکھتے تو حیرت سے پوچھتے ارے راجہ صاحب! آج خالی ہاتھ کیسے - اتنے میں میاں سعید - مجید - حمید وغیرہ نشہ میں چور - سگرٹ کے دھویں بھکا بھک اُڑاتے نظر آئے - کملا چرن کو دیکھتے ہی سب کے سب سرپٹ دوڑے اور پانچ کے پانچوں عیوب شرعی کی طرح اُن سے لپٹ گئے -

مجید۔ "آج تم کہاں غائب ہو گئے تھے میاں ؟ قرآن کی قسم مکان کے سیکڑوں چکر لگائے ہونگے۔"

رام سیوک۔ "آج کل عید کی راتیں ہیں۔ بھئی آنکھیں نہیں دیکھتے ہو نشہ سا چڑھا ہوا ہے۔"

چندولال۔ "چین کر رہا ہے پٹھا۔ جب سے نازنیں گھر میں آئی ہے اس مرد خدا نے بازار کی صورت تک نہیں دیکھی۔ جب دیکھئے گھر میں گھسا رہتا ہے۔ خوب چین کرلے یار۔ دوستوں کی طرف سے بھی بوسے لے لیا کر۔"

کملا۔ "چین کیا خاک کروں۔ یہاں تو قید میں پھنس گیا۔ تین دن سے بورڈنگ میں پڑا ہوا ہوں۔"

مجید۔ "ارے! خدا کی قسم!"

کملا۔ "تیرے جان کی قسم۔ پرسوں سے مٹی پلید ہو رہی ہے۔ آج سبھوں کی آنکھیں بچا کر نکل بھاگا۔"

رام سیوک۔ "اُف! مصیبت سی مصیبت ہے۔ مگر یار خوب اُڑے۔ وہ مچھندر سپرنٹنڈنٹ جھلا رہا ہوگا۔"

کملا۔ "اس معرکے کے جوڑ چھوڑ کر کتابوں میں سر کون مارتا۔ اسکی مدتوں سے آرزو تھی۔"

سعید۔ "یار آج اُڑ آئے تو کیا۔ حق یہ ہے کہ تمہارا وہاں رہنا ستم ہے۔ روز تو نہ آسکو گے۔ اور یہاں آئے دن نئی نئی سیریں۔ نئی نئی دلچسپیاں۔ کل لال ڈگی پر۔ پرسوں پریڈ پر۔ نرسوں بیڑے کا میلہ کہاں تک گناؤں۔ تمہارا جانا بُرا ہوا۔"

کملا۔ "کل کی کٹاؤ تو بندہ ضرور دیکھیگا۔ چاہے ادھر کی دنیا اُدھر جائے۔"

سعید۔" اور بیٹرونکا میلہ نہ دیکھا تو حسرت رہ جائیگی"

سہ پہر کے وقت کملا چرن یاران شاطر سے رخصت ہوکر۔ بادل ناخواستہ بورڈنگ ہاوس کی طرف چلا دل میں ایک چور سا بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ پر پہونچکر جھانکنے لگا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نہوں تو لپک کر کمرہ میں چلا جاؤں۔ مگر دیکھتا ہے تو وہ بھی باہر ہی کی طرف آرہے ہیں۔ دل کو خوب مضبوط کرکے اندر داخل ہوا سپرنٹنڈنٹ صاحب بولے "اب تک کہاں تھے؟"

لہجہ ایسا درشت تھا کہ کملا چرن بمشکل ترکی بہ ترکی جواب دینے سے باز رہا مغرورانہ انداز سے بولا "ایک ضرورت سے بازار چلا گیا تھا"

سپرنٹنڈنٹ "یہہ بازار جانیکا وقت نہیں ہے"

کملا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا آئندہ سے احتیاط رکھونگا"

رات کو جب کملا چارپائی پر لیٹا تو سوچنے لگا یار آج تو بچ گیا۔ مگر مزہ تو جب ہو کہ کل بھی بچوں۔ اور پرسوں بھی حضرت کے آنکھوں میں خاک ڈالوں۔ کل کا نظارہ واقعی قابل دید ہوگا۔ کنکوے آسمان سے باتیں کرینگے۔ اور لمبے لمبے پیچ ہونگے۔ نوشاد مرزا بلاکی بازی لڑاتا ہے۔ یہہ خیال کرتے کرتے سوگیا۔ دوسرے دن پھر علی الصباح بورڈنگ ہاوس سے نکل بھاگا۔ یاران دلنواز لال ڈگی پر اسکے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی باغ باغ ہوگئے۔ اور بیٹھ ٹھوکی۔

کملا چرن کچھ دیر تک تو کٹا ہو دیکھتا رہا۔ پھر شوق چرایا کہ کیوں نہ میں بھی اپنے کنکوے منگاؤں۔ اور اپنی تیز دستی کے کرتب دکھاؤں۔ سعید نے بھڑکایا بد بد کر لڑاؤ۔ روپیہ ہم دینگے۔ چٹ آدمی دکھانا تاؤ۔ مکان پر آدمی دوڑا دیا۔ کامل یقین تھا

کہ اپنے مانجھے سے یہاں ستھراؤ کردونگا۔ مگر آدمی گھر سے خالی ہاتھ لوٹا۔ تب تو حضرت کو تاب نہ رہی۔ بدن میں آگ سی لگ گئی۔ ھنٹر لیکر دوڑے اور مکان پر آتے ہی کہاروں کو ایک سرے سے سٹر سٹر پیٹنا شروع کیا۔ غریب بیٹھے حقّہ تمباکو کر رہے تھے۔ ہنٹر پڑے اور بے خطا۔ بیقصور۔ تو بھنیں مار مار کر رونے لگے۔ سارے محلہ میں ایک شور سا برپا ہو گیا۔ کسی کے سمجھ میں نہ آیا کہ ہماری کیا خطا ہے۔ یہاں کہاروں کی خاطر خواہ مرمت کر کے کملا چرن اپنے کمرہ میں پہونچے۔ مگر وہاں کی کیفیت دیکھکر غصّہ بخار کے درجہ تک پہونچگیا۔ تپتنگ پھٹے ہوئے تھے۔ چرخیاں لوٹی ہوئی۔ اور مانجھے کی لچھیاں اُلجھی ہوئی۔ گویا کسی وبا نے اِن ہوائی جنگ آوروں کا ستیاناس کر دیا۔ سمجھ گئے کہ ضرور اماں نے یہہ حرکت کی ہے۔ غصّہ سے لال ماں کے پاس آئے۔ اور زور زور سے کہنے لگے "کیوں اماں۔ کیا تم سچ مچ میری جان ہی لینے پر آگئی ہو۔ تین دن ہوئے قید خانہ میں بھجوا دیا۔ مگر اتنے پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ میری دلچسپی کے جو ساماں تھے وہ سب برباد کر ڈالے۔ کیوں؟"

پریموتی (حیرت سے) "مینے تو تمہاری کوئی چیز نہیں چھوئی۔ کیا ہوا؟"

کملا (بگڑ کر) "جھوٹوں کے مُنہ میں کیڑے پڑتے ہیں۔ اگر تم نے میری چیزیں نہیں چھوئیں تو کسکی مجال ہے جو میرے کمرہ میں جاکر میرے کنکوے اور چرخیاں سب توڑ پھوڑ ڈالے۔ کیا اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا؟"

پریموتی۔ "تمہارے سر کی قسم میں نے اس کمرہ میں قدم نہیں رکھا۔ چلو دیکھوں کون کون چیزیں لوٹی ہیں؟"

یہہ کہکر پریموتی تو اس کمرہ کی طرف چلی۔ اور کملا غصّہ میں بھرے آنگن میں کھڑے

رہے کہ اتنے میں مادھوی برجن کے کمرہ سے نکلی اور اُنکے ہاتھ میں ایک رقعہ دیکر چلی گئی۔ لکھا ہوا تھا۔

خطا میں نے کی ہے خطاوار ہوں ✤ سزا دیجیے جو سزاوار ہوں

یہ پُرزہ دیکھتے ہی کملا بھیگی بلّی بنگیا۔ دبے پانوں مردانے کی طرف چلا۔ پرمیوتی نے پردہ کی آڑ سے سسکتے ہوئے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کیا تھا۔ اُسے منع کیا۔ اور اُسیوقت چند اور کنکوے جو بچے ہوئے تھے پھاڑ ڈالے۔ چرخیاں ریزہ ریزہ کر ڈالیں اور ڈور میں دیا سلائی لگا دی۔ ماں اُسکی یہ مجنونانہ حرکت دیکھ رہی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ماجرا ہے۔ کہاں تو ابھی انھیں چیزوں کے لئے دنیا سر پر اُٹھائی۔ اور کہاں خود ہی اُنکے پیچھے پڑ گئے۔ سمجھی شاید مارے غصہ کے یہ حرکت کر رہا ہے۔ منانے لگی۔ مگر کملا کے چہرہ سے غصہ مطلق ظاہر ہوتا تھا۔ سنجیدگی سے بولا۔ "میں غصہ میں نہیں ہوں۔ آج سے پکا ارادہ کرتا ہوں کہ پتنگ کبھی نہ اُڑاؤنگا۔ میری حماقت تھی کہ اِن چیزوں کے لئے آپ سے جھگڑ بیٹھا۔"

جب کملا چرن کمرہ میں اکیلا رہ گیا تو سوچنے لگا بیشک میرے کنکوے اُڑانا اُنھیں ناپسند ہے۔ دل سے نفرت کرتی ہیں۔ ورنہ مجھپر یہ ظلم ہرگز نہ کرتیں۔ کاش ایکبار اُنسے ملاقات ہو جاتی تو پوچھتا کہ تمھاری کیا مرضی ہے۔ مگر کون مُنہ دکھاؤنگا۔ ایک تو کوڑھ مغز۔ اُسپر اپنی حماقت کے کئی بار ثبوت دے چکا۔ سیندوالے معاملہ کی خبر انھیں ضرور ہی ہوئی ہوگی۔ انھیں صورت دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ اب تو یہی علاج ہے کہ یا تو اُنکی صورت دیکھوں اور نہ اپنی دکھاؤں۔ یا کسی طرح کچھ علم حاصل کروں۔ ہائے! ظالم نے کیسی صورت پائی ہے۔ عورت نہیں حور معلوم ہوتی ہے۔ کیا کبھی وہ دن بھی ہونگے کہ میں اُسے پیار کرونگا۔ اور میرے پیار کے بدلے وہ بھی مجھے پیار کریگی۔ اسوقت تو شاید میں شادی مرگ ہو جاؤں

کیا سُرخ سُرخ رسیلے ہونٹ ہیں۔ مگر ہے ظالم۔ رحم تو اُسے چھو نہیں گیا۔ کہتی ہے سزا دیجئے۔ جو سزاوار ہوں۔ کیا سزا دوں۔ اگر آ جاؤ تو گلے سے لگا لوں۔ اور انگشت بوسے لوں۔ یہی تمہاری سزا ہے۔ اور بشرط زندگی کبھی نہ کبھی یہ سزا دونگا ضرور۔ اچھا تو اب آج سے پڑھنا چاہیئے۔ یہ سوچتے سوچتے اُٹھا اور در بہ کھولکر کبوتروں کو اُڑوانے لگا۔ سیکڑوں ہی جوڑے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھکر۔ آسمان میں تارے بن جائیں۔ اُڑیں تو دن بھر اُترنے کا نام نہ لیں۔ شہر کے کبوتر باز ایک ایک جوڑے کے بدلے غلامی لکھانے کو تیار تھے۔ مگر دم زدن میں سب کے سب اُڑا دئے۔ جب در بہ صاف ہوگیا تو کہار سے انکو حکم دیا کہ اسے اُٹھا لیجاؤ۔ اور آگ میں جلا دو۔ چھتہ بھی گرا دو۔ ورنہ سب کبوتر آ سپر آکر بیٹھیں گے۔ کبوتروں کا قصہ پاک کر کے بٹیروں اور بلبلوں کی طرف مخاطب ہوئے۔ اور انھیں بھی بند قفس سے آزاد کر دیا۔

باہر تو یہ گل کھلا ہوا تھا۔ اندر پرموتی مہاتی پیٹ رہی تھی کہ نہیں معلوم لڑکا کیا کرنے پر آیا ہے۔ برجن کو بلا کر کہا۔ بیٹی بچا کو کسی طرح روکو۔ نہیں معلوم اُسنے دل میں کیا ٹھانی ہے۔ یہ کہکر رونے لگی۔ برجن کو بھی شک ہو رہا تھا کہ ضرور اُنھوں نے کچھ اور نیت کی ہے۔ ورنہ اس جھلاہٹ کے کیا معنی۔ گو کملا بدشوق تھا۔ بد اخلاق تھا۔ آوارہ تھا مگران سب عیبوں کے ساتھ اسمیں ایک بڑا وصف بھی تھا۔ جسکی کوئی عورت ناقدری نہیں کر سکتی۔ اسے برج رانی سے سچی محبت تھی۔ اور اسکا نادانستہ طور پر کئی بار اظہار ہو چکا تھا۔ یہی سبب تھا جسنے برجن کو اتنا دلیر بنا دیا تھا۔ اوسنے کاغذ نکالا اور یہ پرزہ باہر بھیجا۔

پیارے! یہ خفگی کسپر ہے۔ کیا مجھپر اور محض اسلئے کہ میں نے عجلت کر کے دو تین کنکوے پھاڑ ڈالے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنی سی بات پر ایسے برگشتہ ہو جائیں گے

تو ہرگز انھیں ہاتھ نہ لگاتی مگر اب تو خطا ہو گئی۔ معاف فرمائیے۔ یہہ پہلی خطا ہے۔

آپ کی برج رانی

کملا چرن یہہ خط پاکر ایسا خوش ہوا گویا ساری دنیا کی دولت ہاتھ لگ گئی۔ جواب دینے کا شوق چرّایا۔ مگر قلم ہی نہیں اُٹھتا۔ نہ القاب ملتا ہے۔ نہ آداب۔ نہ اُٹھان کا خیال ہوتا ہے۔ نہ خاتمہ کا۔ ہرچند چاہتا ہے کہ کوئی عاشقانہ رنگ کا پھڑکتا ہوا خط لکھوں۔ مگر عقل ذرا بھی نہیں دوڑتی۔ آج پہلی بار کملا چرن کو اپنی بے علمی اور جہالت پر رونا آیا۔ افسوس! میں ایک سیدھا سا خط بھی نہیں لکھ سکتا۔ اس خیال سے وہ رونے لگا۔ اور کمرہ کے دروازے بند کر لئے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

سہ پہر کے وقت منشی شیاما چرن گھر پر آئے تو سب سے پہلی چیز جو نظر پڑی وہ آگ کا الاؤ تھا۔ نوکروں سے متعجب ہو کر پوچھا یہہ الاؤ کیسا ہے۔ نوکروں نے جواب دیا "حضور دربا جل رہا ہے"۔

منشی جی (گھڑک کر) "اسے کیوں جلاتے ہو۔ کبوتر کہاں رہیں گے"۔

کہار "چھوٹے بابو کا حکم ہے کہ سب دربے جلا دو"۔

منشی جی "کبوتر کہاں گئے"۔

کہار "سب اُڑا دیئے ایک بھی نہیں رکھا۔ کنکوے سب پھاڑ ڈالے۔ ڈور جلا دی۔ بڑا نکسان کیا"۔ کہار نے اپنے دانست میں مار پیٹ کا بدلہ لیا۔ غریب سمجھا کہ منشی جی اس نقصان کے لئے کملا چرن کو سخت سست کہیں گے۔ مگر منشی جی نے یہہ ماجرا سنا تو سکتے میں آ گئے۔ انھیں جانوروں پر کملا چرن جان دیتا تھا۔ آج یکایک کیا کایا پلٹ ہو گئی۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ کہار سے کہا بچہ کو بھیج دو۔ ایک منٹ میں کہار نے آکر کہا

اچھور دروتّجہ اندر سے بند ہے بہت کھٹکھٹایا کھولتے ہی نہیں۔"

اتنا سُننا تھا کہ منشی جی کا خون خشک ہوگیا۔ فوراً شبہہ ہوا کہ بچہ نے زہر کھالیا۔ آج ایک زہرخورانی کا مقدمہ فیصل کرکے آئے تھے ننگے پاؤں دوڑے۔ اور بندکمرہ کے دروازہ پر زور سے لات مار کر کہا "بچہ بچہ!" یہ کہتے کہتے گلا پھنس گیا۔ کملا نے باپ کی آواز سُنی۔ تو فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ اور اُٹھ کر دروازہ کھولدیا۔ مگر اُسے کتنا تعجب ہوا جب منشی جی نے بجائے لعن طعن کرنے کے اُسے سینہ سے لپٹالیا اور گھبراکر پوچھا "بچہ تمھیں میرے سر کی قسم بتادو۔ تمنے کچھ کھا تو نہیں لیا؟" کملاچرن نے اس سوال کا مطلب سمجھنے کے لئے منشی جی کی طرف آنکھیں اُٹھائیں تو اُنمیں آنسو تھے۔ منشی جی کو اب یقین کامل ہوگیا کہ ضرور آفت آگئی۔ ایک کہار سے کہا ڈاکٹر صاحب کو بُلا لا۔ کہنا ابھی چلئے۔ اب جاکے کملا نے باپ کی اس گھبراہٹ کا مطلب سمجھا۔ دوڑ کر اُنسے لپٹ گیا اور بولا "آپ کا شبہہ بالکل بیجا ہے۔ آپ کے سر کی قسم۔ میں بالکل اچھا ہوں۔"

مگر ڈپٹی صاحب کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ سمجھے یہ مجھے روک کر دیر کیا چاہتا ہے تاکہ اپنا کام تمام کرے۔ منت کرکے بولے بچہ ایشور کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ میں صندوق سے ایک دوا لیتا آؤں۔ میں کیا جانتا تھا کہ تم اس نیت سے بورڈنگ ہوس جارہے ہو۔

کملا "بخدا میں بالکل اچھا ہوں۔ آپکا شبہہ بالکل غلط ہے۔ میں ایسا غیرتمند ہوتا تو آج ایسا جاہل تھوڑے ہی بنا رہتا۔ آپ خواہمخواہ ڈاکٹر صاحب کو بلارہے ہیں۔"

منشی جی۔ (کچھ کچھ یقین کرکے) "کواڑ بند کرکے کیا کررہے تھے؟"

کملا۔ "جی اندر سے ایک خط آگیا تھا اُسکا جواب لکھ رہا تھا۔"

منشی جی "اور یہ کبوتر وغیرہ کیوں اُڑادیئے؟"

کملا" اسی لئے کہ خوب اطمینان سے پڑھوں۔ انھیں خرافاتوں میں میرا وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ آج میں نے انکا خاتمہ کر دیا۔ اب آپ دیکھیں گے کہ میں کیسا جی لگاتا ہوں"

بارے ڈپٹی صاحب کے ہوش بجا ہوئے۔ اندر آکر پریموتی سے حال پوچھا تو اُسنے ساری رامائن کہہ سُنائی۔ انھوں نے جب سُنا کہ برجن نے غصہ میں آکر کملا کے کنکوے پھاڑ ڈالے۔ اور چرخیاں توڑ ڈالیں تو بے اختیار ہنس پڑے اور کملا کی دیہیونکی خانہ بربادی کا راز سمجھ میں آگیا۔ بولے "قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہو ان لالہ کو درست کرکے چھوڑیگی۔ آجکل دفتر سے آتا ہوں تو اکثر گھر ہی پر بیٹھے پاتا ہوں۔ کبھی کبھی کتاب بھی کھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ آگئے حضرت بیوی کے پنجہ میں۔ دیکھ لینا اب سنبھل جائینگے"

پندرھویں فصل

بدگمانی

برج رانی کی رخصتی کے بعد سُباما کا گھر ایسا سونا ہو گیا گویا قفس سے چڑیا اڑ گئی۔ وہ اس گھر کا اُجالا۔ اور اس جسم کی جان تھی۔ مکان وہی ہے۔ مگر در و دیوار پر حسرت چھائی ہوئی ہے۔ مکین وہی ہیں مگر سب کے چہرے افسردہ اور آنکھیں غمناک ہو رہی ہیں۔ گلشن وہی ہے مگر خزاں رسیدہ۔ رخصتی کے بعد مہینہ بھر کے اندر منشی سنجیون لال بھی تیرتھ جاترا کو سدھارے مال دولت جو کچھ تھا پرتاپ کو سونپ دیا۔ اپنے ساتھ مرگ چھالا۔ بھگوت گیتا اور چند اور کتابوں کے سوا اور کچھ نہ لیگئے۔

پرتاپ چند پُرزور محسوسات کا نوجوان تھا۔ مگر اسکے ساتھ ہی ضبط کی انتہائی قوت بھی اُسے حاصل تھی۔ مکان کی ایک ایک چیز اُسے برجن کی یاد دلاتی رہتی۔ یہہ خیال دل سے ایک لمحہ کے لئے بھی دور نہو تا کہ کاش برجن میری ہوتی تو کیسے لُطف سے زندگی بسر ہوتی۔ مگر اس خیال کو وہ دور کرتا رہتا تھا۔ پڑھنے بیٹھتا تو کتاب کھلی رہتی اور خیال کہیں اور جا پہونچتا۔ کھانا کھانے بیٹھتا تو برجن کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگتی۔ جذبۂ محبت کو ضبط کی طاقت سے دباتے دباتے یہ حال ہو گیا گویا برسوں کا مریض ہے۔ عشاق کو اپنے تمناؤں کے پوری ہونے کی امید ہو یا نہو۔ مگر وہ دل ہی دل میں اپنے معشوق کے دیدار کا لطف اُٹھاتے رہتے ہیں۔ وہ عالم خیال میں معشوق سے باتیں کرتے ہیں چھیڑتے ہیں روٹھتے ہیں۔ مناتے ہیں۔ ان تصورات سے اُنھیں تسکین ہوتی ہے۔ اور دلکو ایک پُر مزہ اور خوشگوار شغل ہاتھ آجاتا ہے مگر کاش کوئی طاقت اُنھیں اِس گُلشنِ خیال کی سیر کرنے سے روکے۔ کاش کوئی طاقت اُنھیں خیال میں بھی تصویر یار کا دیدار نکرنے دے تو اُن بدقسمت بندگانِ محبت کی کیا گت ہوگی۔ پرتاپ انھیں بدقسمت شخصوں میں تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ چاہتا تو مسرت بخش خیالات کا لُطف اُٹھا سکتا تھا۔ عالم خیال کی سیر ظاہری دلچسپیوں سے کم لطف انگیز نہیں ہوتی۔ مگر مشکل تو یہہ تھی کہ وہ برجن کے خیال کو بھی عاشقانہ جذبات کی آلایش سے پاک رکھنا چاہتا تھا۔ اسکی تربیت ایسے پاکیزہ اصولوں پر ہوئی تھی۔ اور اُسے ایک نیک منش پاک باطن بزرگ کی صحبت سے فیض اُٹھانے کے ایسے اچھے موقعے ملے تھے کہ اُسکی نگاہوں میں خیالات کی پاکیزگی کی اتنی ہی وقعت تھی جتنی فعلونکی پاکیزگی کی۔ یہہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ برجن کو۔ جسے بارہا بہن کہہ چکا تھا۔ جسے اب بھی بہن سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ عالم خیال میں بھی ایسے تصورات اور جذبات کا مرکز بناتا جو خباثت سے کیسے ہی پاک ہوں۔ مگر نفس سرکش کی حوصلہ افزائیوں سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ جب تک منشی سجیون لال موجود تھے اُسکا کچھ نہ کچھ وقت اُنکے ...

گیان اور معرفت کے چرچوں میں کٹ جاتا تھا۔ جس سے روح کو گونہ تشفی ہوتی تھی۔ مگر اُنکے چلے جانے کے بعد تربیت نفس کے یہہ موقعے بھی جاتے رہے۔

سُبا ماُ اُسے ہر دم دلگرفتہ پاتی تو اُسے بہت صدمہ ہوتا۔ ایک روز اُسنے کہا کہ تمہاری طبیعت یہاں نہ لگتی ہو تو کچھ دنوں کے لئے الہ آباد چلے جاؤ۔ وہاں شاید تمہاری طبیعت بحال ہو جاوے۔ یہہ خیال پرتاپ کے دل میں کئی بار پیدا ہوا تھا۔ مگر اس خوف سے کہ ماں کو تنہائی بہت شاق گذریگی اُسنے کبھی اِس تجویز پر غور نہیں کیا تھا۔ ماں کی طرف سے اشارہ پایا تو ارادہ پختہ ہو گیا۔ سفر کی تیاریاں کرنے لگا۔ روانگی کا دن مقرر ہو گیا۔ اب سُبا ماُ کا یہہ حال ہے کہ جب دیکھئے پرتاپ کو پردیس میں رہنے سہنے کے متعلق ہدایتیں کر رہی ہے۔ بیٹا دیکھو کسی سے رار مت مول لینا۔ جھگڑے ٹنٹے کی تو تمہاری ویسے بھی عادت نہیں ہے۔ مگر سمجھا دیتی ہوں۔ پردیس کا واسطہ ہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ کھانے پینے میں بے احتیاطی نکرنا۔ تمہاری یہہ بڑی بُری عادت ہے کہ جاڑوں میں سر شام سے سو جاتے ہو پھر کوئی کھانے کے لئے کتنا ہی جگائے سنکتے تک نہیں۔ آپ بھی اُپاس کرتے ہو۔ دوسروں کو بھی اُپاس کراتے ہو یہہ عادت پردیس میں بنی رہی تو تمھیں رات کا کھانا کاہیکو میسر ہوگا۔ دن کو ذرا دیر کے لئے آرام کر لیا کرنا۔ تمہارے آنکھوں میں تو دن کو جیسے نیند ہی نہیں رہتی۔ اُسے جب موقع ملتا بیٹے کو ایسی ہی مادرانہ نصیحتیں کیا کرتی۔

آخر روانگی کا دن آپہونچا۔ گاڑی دس بجے دن کو چھوٹتی تھی۔ پرتاپ نے سوچا برجن سے ملاقات کر لوں۔ پردیس جا رہا ہوں۔ پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔ دل نے گدگدایا۔ ماں سے کہہ بیٹھا۔ سُبا ما بہت خوش ہوئی۔ ایک طشت میں حلوا اور سموسے اور دو تین قسم کے مُربّے رکھکر دھیا کو دیئے کہ لڑکے کے ساتھ جا۔ پرتاپ نے خط صاف کیا۔ کپڑے

بدلے۔ اور بن سنور کر چلے۔ مگر چلنے کو تو چلے۔ اب جوں جوں قدم آگے اُٹھتا ہے دل بیٹھا جاتا ہے۔ طرح طرح کے خیالات آ رہے ہیں۔ نہ جانے من میں کیا سمجھے۔ کیا نہ سمجھے چار مہینے گذر گئے۔ اُسنے مجھے ایک خط بھی تو الگ نہیں لکھا۔ پھر کیونکر کہوں کہ میرے ملنے سے اُسے خوشی ہوگی۔ ابجی اب اُسے تمہاری فکر ہی کیا ہے۔ تم مر بھی جاؤ تو وہ آنسو نہ بہائے۔ یہاں کی بات اور تھی۔ وہاں کی بات اور ہے۔ اور مجھے یہہ کیا حماقت سوجھی کہ نیا سوٹ پہنکر آیا۔ یہہ ضرور اُسکی نگاہوں میں کھٹکیگا۔ کہیں یہہ نہ سمجھے کہ لالہ جی بن ٹھن کر مجھے رجھانے آئے ہیں۔ اسی حیص و بیص میں بڑھتا چلا آتا تھا۔ یہانتک کہ شیاما چرن کا مکان نظر آنے لگا۔ اور کملا صحن میں چہل قدمی کرتا دکھائی دیا۔ اُسے دیکھتے ہی پرتاپ کی وہ کیفیت ہو گئی جو کسی چور کی سپاہی کو دیکھکر ہوتی ہے۔ فوراً ایک مکان کی آڑ میں چھپ گیا۔ اور بڑھیا سے بولا "تو جا۔ یہہ چیزیں دیتی آ۔ میں ذرا ایک ضرورت سے بازار جا رہا ہوں۔ لوٹتا ہوا آؤنگا۔" یہہ کہکر بازار کی طرف چلا مگر دس ہی قدم گیا کہ پھر مہری کو بلایا اور بولا۔ "مجھے شاید دیر ہو جائے۔ اسلئے ادھر نہ آسکونگا۔ کچھ پوچھیں تو یہہ پرزہ دیدینا۔" یہہ کہکر جیب سے پنسل نکالی۔ اور چند سطریں لکھکر دیدیں۔ جس سے اسکی قلب کی کیفیت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔

میں آج الہ آباد جا رہا ہوں۔ اب وہیں پڑھونگا۔ تم سے عجلت کے باعث نہ مل سکا۔ زندہ رہونگا تو پھر آؤنگا۔ کبھی کبھی اپنی خیر و عافیت سے اطلاع دیتی رہنا۔

تمہارا پرتاپ

پرتاپ تو یہہ پرزہ دیکر رخصت ہوا۔ اور بڑھیا آہستہ آہستہ برجن کے گھر پہونچی۔

وہ اسے دیکھتے ہی دوڑی۔ اور خیر و عافیت پوچھنے لگی " لالہ کی کوئی چٹھی آئی تھی؟"

بڑھیا:- جب سے گئے چٹھی پتر کچھ ناہیں آوا"

برجن:- "چچی تو آرام سے ہیں"

بڑھیا:- للّو بابو پراگ راج جات ہیں توں تنک اُداس رہت ہیں"

برجن:- "(چونک کر) للّو پراگ جا رہے ہیں"

بڑھیا:- ہاں۔ ہم سب بہت سمجھاوا کہ پردیس میں کہاں جیہو۔ مدا کوؤ کی سُنت ہیں؟"

برجن:- "کب جائیں گے؟"

بڑھیا:- "آج دس بجے کے ٹیم سے جوّیا ہیں۔ تم سے بھینٹ کرن آوت رہے۔ توں دوار پر آئے کے لوٹ گئے"

برجن:- "یہاں تک آ کے لوٹ گئے۔ دروازہ پر کوئی تھا یا نہیں؟"

بڑھیا:- دوار پر کہاں آئے۔ سڑک پر سے چلے گئے"

برجن:- "کچھ کہا نہیں کیوں لوٹا جاتا ہوں"

بڑھیا:- کچھ نہیں۔ اتنا بولے کہ ہمار ٹیم چھوٹ جیہے توں ہم جات ہیں"

برج رانی نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ پریموتی کے پاس جا کر بولی:- "اماں للّو آج الٰہ آباد جا رہے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ذرا اُن سے ملتی آؤں۔ پھر نہ جانے کب ملنا ہو کب نہ ہو مہری کہتی ہے کہ وہ مجھ سے ملنے آتے تھے مگر سڑک کے اُسی پار سے لوٹ گئے۔"

پریموتی:- ابھی نہ بال گندھوائے۔ نہ مانگ بھروائی۔ نہ کپڑے بدلے۔ اور جانے کو تیار ہو گئیں۔"

برجن:- "میری اماں، جی آج جانے دیجئے۔ بال آل گندھوانے بیٹھوں گی تو دس یہیں بج جائینگے"

پریموتی: "اچھا تو جاؤ۔ مگر شام تک لوٹ آنا۔ گاڑی تیار کرا لو۔ میری طرف سے سُباما کو پالاگن کہدینا۔" برجن لپکی ہوئی کمرہ میں آئی۔ کپڑے بدلے۔ مادھوی کو باہر دوڑایا کہ گاڑی تیار کرنے کے لئے کہہ آ۔ تب تک کچھ خیال آیا۔ ردھیا سے پوچھا "کچھ چٹھی پتر نہیں دیا۔"

ردھیا نے پُرزہ نکالکر دیدیا۔ برجن نے اُسے بڑے شوق سے لیا۔ مگر اُسے پڑھتے ہی اُسکا چہرہ کمھلا گیا۔ سوچنے لگی کہ وہ دروازہ تک آکر کیوں لوٹ گئے۔ اور خط بھی لکھا تو ایسا اُکھڑا مہمل۔ "جیہ خوش! ہمسے عجلت کے باعث نہ مل سکے۔" ایسی کیا عجلت تھی۔ کیا گاڑی کے نوکر تھے۔ دن بھر میں کچھ نہیں تو پانچ چھ گاڑیاں جاتی ہونگی۔ کیا مجھسے ملنے کے لئے اُنسے دو گھنٹہ کی دیر بھی برداشت نہو سکی۔ ضرور اسمیں کچھ نہ کچھ راز ہے۔ مجھسے کون سی خطا ہوئی۔ یکایک اُسے اسوقت کی یاد آئی جب وہ عالم بیقراری میں پرتاپ کے پاس گئی تھی۔ اور اُسکے زبان سے نکلا تھا "للو مجھسے کیسے صبر ہوگا۔" برجن کو اب سے پہلے کئی بار خیال آچکا تھا کہ میرا اسوقت کا۔ اور اس حالت میں جانا بہت ہی نامناسب تھا۔ اسوقت یقین ہوگیا کہ میں ضرور للو کی نگاہوں میں گر گئی۔ میری محبت اور عزت اب اُنکے دل میں نہیں ہے۔ ایک ٹھنڈی سانس لیکر بیٹھ گئی۔ اور مادھوی سے بولی "کوچبان سے کہدے گاڑی نہ تیار کرے۔ میں نہ جاؤنگی۔"

سولھویں فصل

فرض اور محبت کی کشمکش

جسوقت تک برج رانی سسرال نہ آئی تھی اُسکی نگاہوں میں ایک ہندو پتی برتا عورت کے فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی اعلیٰ معیار نہ قائم ہوا تھا۔ گھر میں کبھی اُسکے شوہر کا ذکر نہ آتا۔ یا اگر آتا تو ناخوشگوار طریقے پر۔ اسنے استری دھرم کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ مگر انکا کوئی دیرپا اور متحرک اثر اُسپر نہوا تھا۔ غالباً اُسے یہہ خیال ہی نہ آتا کہ یہہ گھر میرا نہیں ہے۔ اور مجھے بہت جلد یہاں سے جانا پڑیگا۔

مگر جب وہ سسرال میں آئی۔ اور اپنے دل و جان کے مالک۔ اپنے آقا۔ اپنے شوہر کو ہر دم آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگی تو رفتہ رفتہ اُسکے دل کی کیفیت متغیر ہونا شروع ہوئی۔ روشن ہوا کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میرا کیا دھرم ہے اور مجھے کسطرح اپنا دھرم نباھنا چاہئے۔ اگلی باتیں خواب سی معلوم ہونے لگیں۔ ہاں جسوقت یاد آجاتا کہ کم از کم ایک خطا مجھ سے ایسی ہوئی ہے جسکی میں تلافی نہیں کرسکتی۔ تو وہ خودبخود شرم سے سر جھکا لیتی اور اپنے تئیں کوستی۔ اسے تعجب ہوتا کہ مجھے للو کے سامنے جانے کی کیونکر جرأت ہوئی۔ شاید اس واقعہ کو خواب سمجھنے کی کوشش کرتی۔ تب للو کی شریفانہ صورت اُسکے پیش نظر ہوجاتی۔ اور وہ صدق دل سے اُسے دعا دیتی۔ روز بروز اُسکی محبت اور عزت دل میں زیادہ ہوتی جاتی تھی۔

لیکن آج جب پرتاپ چندر کی تلون مزاجی سے اُسے یہہ خیال کرنے کا موقع ملا کہ للو اُس واقعہ کو ابھی بھولا نہیں ہے اور اُسکی نگاہوں میں میری وقعت نہیں رہی۔ یہانتک کہ وہ میری صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے۔ تو اسے حسرتناک غصہ پیدا ہوا۔ پرتاپ کی طرف سے طبیعت مکدر ہو گئی اور اُسکی جو محبت اور عزت دل میں تھی وہ دم زدن میں پانی کے ابخرات کی طرح غائب ہونے لگی۔ عورتیں انتہا درجہ کی ذکی الحس ہوتی ہیں وہ جتنی یکدلی۔ اور یکسوئی سے محبت کر سکتی ہیں۔ اُتنی ہی سرگرمی سے نفرت بھی کر سکتی ہیں۔ جس پرتاپ کے لئے وہ اپنی ہستی خاک میں ملا دینے کو تیار تھی وہ اُسکے ایک طفلانہ فعل کو بھی درگذر نہیں کر سکتا۔ کیا اُسکا دل ایسا تنگ ہے! یہہ خیال برجن کے پہلو سے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔

آج سے برجن کی زندہ دلی رخصت ہو گئی۔ دل پر ایک بوجھ سا رہنے لگا۔ سوچتی کہ جب پرتاپ مجھے بھول گئے اور میری رتی بھر بھی عزت نہیں کرتے تو اس صدمہ سے میں کیوں اپنی جان کھپاؤں۔ جیسے رام تلسی سے ویسے تلسی رام سے۔ اگر انھیں مجھ سے نفرت ہے۔ اگر وہ میری صورت سے بیزار ہیں۔ تو میں بھی اُنکی صورت سے متنفر ہوں۔ اور مجھے بھی اُنسے ملنے کی خواہش نہیں۔ تب وہ اپنے ہی اوپر جھنجھلا اُٹھتی کہ میں ہر دم انھیں کی باتیں کیوں سوچا کرتی ہوں۔ اور ارادہ کرتی کہ اب اُنکا خیال بھی دل میں نہ آنے دونگی۔ مگر ذرا دیر میں خیال پھر اُسی طرف جا پہونچتا۔ اور وہی خیالات بے چین کرنے لگتے۔ قلبی اور خیالی انتقام کے جوش میں وہ کملا چرن سے خلوص محبت کا اظہار کرنے لگی۔ وہ ذرا دیر کے لئے کہیں چلا جاتا تو اُس سے شکایت کرتی۔ جتنے نقد روپئے جمع کر رکھے تھے وہ سب اُسے دیدیتے کہ اپنے لئے سونے کی گھڑی اور طلائی چین خریدے۔ کملا نے ذرا انکار کیا

تو آبدیدہ ہوگئی۔ وہ یوں ہی اُسکا غلام بنا ہوا تھا۔ اُسکی محبت کا یہ رنگ دیکھکر اور بھی جان دینے لگا۔ دوستوں نے سُنا تو مبارکبادیں دینے لگے میاں حمید اور سعید اپنی اپنی قسمتوں کو کوسنے لگے کہ ایسی محبتی بیوی ہمکو نہ ملی تھیں وہ بنا مانگے ہی یوں سرفراز کرتی ہیں۔ اور یہاں بیویوں کی فرمایشوں کے مارے ناک میں دم ہے۔ چاہے اپنے پاس کانی کوڑی نہو۔ مگر اُنکی فرمائشیں ضرور پوری ہونی چاہئیں۔ ورنہ طوفان نوح برپا ہو جاے۔ ابجی اور کیا کہیں کبھی گھر میں ایک بیڑے پان کے لئے چلے جاتے ہیں تو وہ بھی بے دس پانچ اُلٹی سیدھی سُنے نصیب نہیں ہوتا۔ خدا ہمکو بھی تمہاری سی بیوی عطا کرے۔

یہہ سب تھا۔ کملا چرن بھی محبت کرتا تھا۔ اور برج رانی بھی محبت کرتی تھی۔ مگر دو دلونکے ملنے سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے اُسکا برجن کے چہرہ پر مطلق نشان نہ تھا۔ روز بروز زرد اور نحیف ہوتی جاتی تھی۔ کملا چرن قسمیں دے دیکر پوچھتا کہ تم دُبلی کیوں ہوتی جاتی ہو۔ اُسے خوش رکھنے کی جو جو تدبیریں بن پڑتیں کرتا یار دوستوں سے بھی اس اہم معاملہ میں مشورہ لیتا۔ مگر کچھ کارگر نہوتا تھا۔ برج رانی ہنسکر کہدیا کرتی کہ تم کچھ فکر نکرو۔ میں بالکل اچھی ہوں۔ یہہ کہتے کہتے اُٹھکر اُسکے بالوں میں کنگھی کرنے لگتی۔ یا پنکھا جھلنے لگتی۔ اِن خاطرداریوں سے کملا چرن پر تھوڑی دیر کا سرور ہو جاتا۔ مگر لکڑی کے اوپر رنگ روغن لگانے سے وہ کیڑا نہیں مرتا جو اندر بیٹھا ہوا اُسکا کلیجہ کھائے جاتا ہے۔ یہہ خیال کر پرتاپ چندر مجھے بھول گئے۔ اور میں اُنکی نظروں میں گر گئی ناسور کی طرح اُسکے کلیجہ میں چھید کیا کرتا تھا۔ اُسکی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ یہانتک کہ بستر سے اُٹھنا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹروں کا علاج ہونے لگا۔

اُدھر پرتاپ چندر کی طبیعت الٰہ آباد میں سنبھل چلی تھی۔ ورزش کا تو اُسے شوق

تھا ہی۔ وہاں اسکا خوب چرچا تھا۔ غم غلط کرنے کا اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے جسمانی محنت سے بڑھکر اور کوئی علاج نہیں ہے صبح کو جمناسٹک اور کُشتی۔ شام کو کرکٹ اور فٹ بال۔ آٹھ نو بجے رات تک باغیچوں کی سیر۔ اتنی محنت کے بعد چارپائی پر گرتا تو سویرے آنکھ کھلتی چھ ہی مہینوں میں کرکٹ اور فٹ بال کا کپتان بن بیٹھا۔ اور دو تین میچ ایسے معرکے کے کھیلے کہ سارے شہر میں دھوم ہوگئی۔

آج علی گڈھ کے ایک زبردست ٹیم سے اُنکا کرکٹ میں مقابلہ تھا۔ یہ ٹیم ہندوستان کے مشہور ٹیموں کو شکست دیتی۔ فتح کا ڈنکا بجاتے ہوئے یہاں پہونچے تھے۔ انھیں غالباً اپنی فتح کی جانب سے بہت اندیشہ نہ تھا۔ وہ کئی مضبوط ٹیموں سے بالا مار چکے تھے۔ مگر اُسکے ساتھ ہی الہ آباد والے بھی مایوس نہ نظر آتے تھے۔ اُنکی اُمیدیں پرتاپ چندر سے وابستہ تھیں۔ اگر وہ آدھ گھنٹہ بھی جم گیا تو رنوں کے انبار لگا دیگا۔ اور اگر اتنی ہی دیر تک گیند چل گیا تو پھر اُدھر کا وارا نیارا ہے۔ پرتاپ کو کبھی اتنا بڑا میچ کھیلنے کا اتفاق نہوا تھا۔ کلیجہ بانسوں اُچھل رہا تھا کہ جانے کیا نتیجہ ہو۔ دس بجے کھیل شروع ہوا۔ پہلے علی گڈھ والوں کے کھیلنے کی باری تھی۔ اور دو ڈھائی گھنٹہ تک انھوں نے خوب جوہر کمال دکھائے۔ ایک بجتے بجتے کھیل کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ علی گڈھ نے ۴۰۰ رن کئے۔ اب الہ آباد والوں کی باری آئی۔ مگر کھلاڑیوں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ یقین ہوگیا کہ بطرح ہارے۔ اب عہدہ برا ہونا محال ہے۔ اتنے رن کون کریگا۔ اکیلے پرتاپ کیا بنا لیگا۔ پہلا کھلاڑی آیا اور تیسرے گیند میں رخصت۔ دوسرا آیا اور مشکل سے پانچ گیند کھیل سکا۔ تیسرا آیا اور پہلے ہی گیند میں کیچ ہوگیا۔ چوتھے نے آکر دو تین معرکے کے ہٹ لگائے مگر جم نہ سکا۔ پانچویں صاحب بلاک کرنے میں شہرۂ آفاق تھے۔ مگر یہاں اُنکی بھی کچھ نہ چلی۔ تھاپی رکھتے ہی رکھتے غائب ہوگئے

اب پرتاپ چندر متانت سے قدم اٹھاتا۔ بیٹ گھماتا میدان میں آیا۔ طرفین نے تالیاں بجائیں۔ الہ آبادیوں کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ ہر شخص کی نگاہیں پرتاپ چندر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سب کے دل دھڑ دھڑ کر رہے تھے چو طرفہ سناٹا چھایا ہوا تھا کچھ لوگ دور بیٹھے ہوئے خدا سے دعا کر رہے تھے کہ پرتاپ سرخرو لوٹے۔ دیوی اور دیوتا یاد کئے جا رہے تھے۔ پہلا گیند آیا۔ پرتاپ نے خالی دیا۔ الہ آبادیوں کے دل اچھ بھر بیٹھ گئے۔ دوسرا گیند آیا۔ وہ بھی خالی گیا۔ الہ آبادیوں کے دل ناف تک پہونچ گئے۔ بہت سے آدمی چھتری سنبھال گھر کی طرف چلے۔ تیسرا گیند آیا۔ ایک پٹاخے کی آواز ہوئی۔ اور گیند شہاب ثاقب کی طرح آسمان کو چیرتا ہوا ہٹ پر کھڑے ہونے والے فیلڈر سے سو گز کے فاصلے پر گرا۔ الہ آبادیوں نے تالیاں بجائیں۔ سوکھے دھان میں پانی پڑا۔ جانے والے ٹھٹک گئے۔ مایوسوں نے پیٹھ سیدھی کی۔ دوسرا گیند آیا۔ اور پہلے والے گیند سے دس گز آگے گرا۔ فیلڈر چونکے۔ ہٹ پر کمک پہونچائی۔ پانچواں گیند آیا اور کٹ پر گیا اتنے میں اودر ہوا۔ بولر بدلے۔ یہ نئے بولر پورے قاتل تھے۔ مہلک گیند پھینکتے تھے۔ مگر انکے پہلے ہی گیند کو پرتاپ نے سورج سے بات کرنے کے لئے آسمان کی طرف بھیج دیا۔ پھر تو گیند اور اسکی تھاپی میں سازش سی ہو گئی۔ گیند آتا۔ اور تھاپی سے بغلگیر ہو کر کبھی پورب کی راہ لیتا۔ کبھی پچھم کی کبھی اُتر کی۔ کبھی دکھن کی۔ فیلڈروں کا دوڑتے دوڑتے ناک میں دم تھا۔ الہ آباد والے اچھلتے تھے بغلیں بجاتے تھے ٹوپیاں ہوا میں اچھل رہی تھیں۔ ایک صاحب نے روپئے نکالکر لٹا دیئے۔ دوسرے صاحب نے اپنی سنہری زنجیر لٹا دی۔ حریف دل میں جلتے جھنجھلاتے۔ کبھی میدان کی ترتیب بدلتے کبھی بولر تبدیل کرتے۔ مگر سب تدبیریں اور چالیں بے اثر ہو رہی تھیں۔ گیند کا تھاپی سے یارانہ ہو گیا تھا۔

کامل دو گھنٹوں تک پرتاپ بٹاتے۔ اور بگولے اور ہوائیاں چھوڑتا رہا۔ اور فیلڈر گیند کی طرف یوں لپکتے جیسے بچے چاند کی طرف لپکتے ہیں۔ رنوں کی تعداد تین سو تک پہونچگئی۔ حریفوں کے چھکے چھوٹے۔ ایسے حواس باختہ ہو رہے تھے کہ ایک گیند بھی سیدھا نہ آتا تھا۔ فیلڈ میں بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی۔ یہانتک کہ پرتاپ نے پچاس رن اور کئے۔ اور اب اُسنے امپائر سے ذرا دم لینے کی مہلت مانگی۔ اُسے آتے دیکھکر ہزاروں آدمی اُسکی طرف لپکے۔ اور اُسے باری باری سے گود میں اُٹھانے لگے۔ چاروں طرف بھگدڑ مچگئی۔ سیکڑوں چھاتے۔ چھڑیاں۔ ٹوپیاں۔ اور جوتے عالم بالا کی سیر کرنے لگے۔ گویا وہ بھی فرط مسرت سے اچھلے پڑتے تھے۔ عین اُسیوقت تار گھر کا چپراسی بائسکل پر آتا ہوا دکھائی دیا۔ قریب آکر بولا "پرتاپ چندر کسکا نام ہے"۔ پرتاپ نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔ اور چپراسی نے تار کا لفافہ اُسکے ہاتھ میں رکھدیا۔ پڑھتے ہی پرتاپ کا چہرہ زرد ہوگیا۔ ٹھنڈی سانس لیکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور بولا "یارو اب میچ کا فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔ میںنے اپنا فرض ادا کردیا۔ اسی ڈاک سے مکان چلا جاؤنگا۔"

یہہ کہکر وہ بورڈنگ ہاؤس کی طرف چلا۔ سیکڑوں آدمی پوچھنے لگے کیا ہے کیا ہے لوگوں کے چہرہ پر مردنی چھاگئی۔ مگر اُسے بات کرنے کی کہاں فرصت۔ اُسیوقت ٹریم پر بیٹھا اور بنارس کی طرف روانہ ہوگیا۔

راستہ بھر اُسکا مل تشویشوں کا جولانگاہ بنا رہا۔ بار بار اپنے کو نفریں کرتا کہ میںنے چلتے وقت کیوں نہ اُس سے مل لیا۔ اب نہ جانے ملاقات ہو یا نہو۔ اگر خدانخواستہ اُسکی صورت دیکھنی نصیب ہوئی تو میں بھی مُنہ میں کالکھ لگاکر کہیں مر رہونگا۔ یہی باتیں پاتی کئی بار رویا۔ نو بجے شب کو گاڑی بنارس پہونچی۔ اُسپر سے اُترتے ہی ہیں اسوقت

کے مکان کی طرف چلا۔ فرط ملال سے آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اور کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب کرسی پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور کملا ڈاکٹر صاحب کے یہاں جانے کو تیار کھڑا تھا۔ پرتاپ چندر کو دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ گیا۔ شیاما چرن نے بھی گلے لگایا اور بولے "کیا ابھی سیدھے الہ آباد سے چلے آرہے ہو؟"

پرتاپ: "جی ہاں۔ آج اماں کا تار پہونچا کر برجن کی حالت بہت خراب ہے۔ کیا ابھی وہی حالت ہے؟"

شیاما چرن: "کیا کہوں۔ ادھر دو تین مہینہ سے روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہے۔ دوا کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ دیکھیں ایشور کو کیا منظور ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو کہتے تھے تپ دق ہے۔ مگر حکیم صاحب ضعف جگر بتلاتے ہیں۔"

برجن کو جب سے خبر ملی کہ پرتاپ چندر آئے ہوئے ہیں تب سے اُسکے دل میں امید اور بیم کی گھڑدوڑ مچی ہوئی تھی۔ کبھی سوچتی کہ گھر آئے ہونگے۔ چچی نے زبردستی ٹھیل ٹھال کر یہاں بھیجا ہوگا۔ پھر خیال ہوا شاید میری بیماری کی خبر پائی ہو۔ گھبرا کر چلے آئے ہوں۔ مگر نہیں۔ اُنھیں میری ایسی کیا فکر پڑی ہے۔ سوچا ہوگا کہیں مر نہ جائے۔ لاؤ چلو دنیا کا برتاؤ تو کرتا آؤں۔ اُنھیں میرے مرنے جینے کا کیا غم۔ آج میں بھی حسرت سے جی کھولکر باتیں کرونگی۔ لیکن نہیں باتوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انھوں نے چپ سادھی ہے تو میں کیوں بولوں۔ بس اتنا کہدونگی کہ بہت اچھی طرح ہوں اور تمھاری خیریت کی دعا کرتی رہتی ہوں۔ پھر زبان نہ کھولونگی۔ اور میں یہ میلی کچیلی ساڑی پہنے کیوں بیٹھی ہوں۔ جو اپنا ہمدرد نہ ہو اسکے آگے یہ صورت بنائے رکھنے سے فائدہ۔ وہ مہمان کی طرح آئے ہیں۔ میں بھی تپاک سے پان لیکے پیش آؤنگی۔ انسان کا دل کیسا پیچیدہ ہے! جس شخص کی سرد مہری کے

پریم چند اُن افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنکا نام ہم انگلیوں پر گن سکتے ہیں

خیال سے برجن کی یہ گت بنا رکھی تھی۔ اُسی شخص کو جلانے کے لئے اپنے ایسے منصوبے باندھ رہی ہے۔

دس بجے کا وقت تھا۔ مادھوی بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ دواؤں کی شیشیاں اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔ اور برجن چارپائی پر پڑی یہی سب باتیں سوچ رہی تھی۔ کہ کہ پرتاپ کمرہ میں داخل ہوا۔ مادھوی چونک کر بولی بہن اُٹھو۔ آ گئے۔ برجن ہک لگا کر اُٹھی۔ اور چارپائی سے اُترنا چاہتی تھی کہ ضعف کے مارے زمین پر گر پڑی۔ پرتاپ نے اُسے سنبھالا۔ اور چارپائی پر لِٹا دیا۔ آہ! یہ وہی برجن ہے جو آج سے چند ماہ قبل حُسن اور شباب کی مورت تھی۔ جسکے کھڑے پر چمک اور آنکھوں میں ہنسی کا بسیرا رہتا تھا۔ جسکا بولنا شیاما کا گانا۔ اور ہنسنا سن کا بھانا تھا۔ وہی رسیلی آنکھوں والی میٹھی باتوں والی برجن اب ایک تودۂ استخوان ہوگئی ہے۔ پہچانی نہیں جاتی۔ پرتاپ کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مزاج کی کیفیت پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر مُنہ سے صرف اتنا نکلا "برجن!" اور آنکھوں سے اشک کے قطرے ٹپکنے لگے۔

محبت کی آنکھیں جذبات کے پرکھنے کی کسوٹی ہیں۔ برجن نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا اور اُن چند قطرہائے اشک نے اُسکے دل کا سب غبار دھو دیا۔

جیسے کسی فوج کا سپہ سالار جو آنے والی لڑائی کا نقشہ دل میں سوچ رہا ہو غنیم کو اپنے پشت پر دیکھ کر بدحواس ہو جاتا ہے۔ اور مجوزہ نقشہ کا خیال بھی اُسے نہیں رہتا۔ اُسی طرح برجن پرتاپ چندر کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب باتیں بھول گئی جو وہ ابھی پڑی پڑی سوچ رہی تھی۔ وہ پرتاپ کو روتے دیکھ کر اپنا سب دُکھ بھول گئی۔ اور چارپائی سے اُٹھ کر آنچل سے اُسکے آنسو پونچھنے لگی۔ پرتاپ جسے خطاوار کہہ سکتے ہیں اسوقت

مظلوم کی حیثیت میں تھا۔ اور برجن جسنے اپنے تئیں گھلا گھلا کر اس حالت کو پہونچا دیا تھا رو رو کر اُس سے کہہ رہی تھی۔ للو چپ رہو۔ ایشور جانتا ہے میں بالکل اچھی ہوں۔ گویا اچھا نہونا اُسکی خطا تھی۔ عورتوں کے احساسات کیسے نازک ہوتے ہیں۔ پرتاپ کی ایک ذرا سی سہل انگاری نے برجن کو اس زندگی سے لاپروا بنادیا تھا۔ اور آج آنسو کی چند بوندوں نے اُسکے دل کی وہ جلن۔ وہ سوز۔ وہ آگ بجھادی جو کئی مہینوں سے اُسکے خون اور جگر کو جلا رہی تھی۔

جو مرض بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کے علاج سے دور نہوا اُسے آنسو کے چند قطروں نے دم زدن میں دور کردیا۔ کیا یہہ پانی کے قطرے امرت کی بوندیں تھیں؟

پرتاپ نے ضبط کرکے پوچھا "برجن! یہہ تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے"

برجن (مسکراکر) "یہہ گت مینے نہیں بنائی۔ تم نے بنائی ہے"

پرتاپ "اماں کا تار نہ پہونچتا تو مجھے اطلاع بھی نہوتی"

برجن "ضرورت کیا تھی جسے بھلانے کے لئے الہ آباد چلے گئے اُسکے مرنے جینے کی تمہیں کیا پروا ہے؟"

پرتاپ "باتیں بنا رہی ہو۔ غیروں کو کیوں خط لکھتیں؟"

برجن "کسے اُمید تھی کہ تم اتنی دور سے آنیکی یا خط لکھنے کی زحمت اُٹھاؤ گے۔ جو دروازہ سے آکر پھر جاوے۔ اور صورت دیکھنے تک کا روادار نہو اُسے خط بھیجکر کیا کرتی"

پرتاپ "اُسوقت لوٹ جانیکا جتنا صدمہ مجھے ہوا میرا دل ہی جانتا ہے۔ تم نے اُسوقت تک میرے پاس کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ مینے سمجھا اب یاد دل سے جاتی رہی"

برجن "اگر میں تمہاری باتوں پر اعتبار کرنے کی عادی نہوتی تو اُسوقت کہدیتی یہہ سب

سوچی ہوئی باتیں ہیں"

پرتاپ "خیر جیسا سمجھو۔ اب یہ بتاؤ کہ طبیعت کی کیا کیفیت ہے میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ ایسا چہرہ اُتر گیا ہے"

برجن "اب اچھی ہو جاؤنگی۔ دوا ملگئی"

پرتاپ کنایہ سمجھ گیا افسوس! میری ذراسی غلطی نے یہہ قیامت ڈھادی۔ دیر تک اُسے سمجھاتا رہا۔ اور علی الصباح جب وہ اپنے گھر چلا تو برجن کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ للّو مجھے بھولے نہیں ہیں۔ اور میری یاد اور عزت اُنکے دل میں قائم ہے۔ پرتاپ نے اُسکے جگر سے وہ کانٹا نکال دیا جو کئی مہینوں سے کھٹک رہا تھا۔ اور جسنے اُسکی یہہ حالت کردی تھی۔ ایک ہی ہفتہ میں اُسکا مکھڑا کندن کی طرح دمکنے لگا۔ گویا کبھی بیمار ہی نہ تھی۔

سترھویں فصل

فرض کی جیت اور محبت کی ہار

مریض جبتک بیمار رہتا ہے اُسے خبر نہیں ہوتی کہ کون میری تیمارداری کر رہا ہے کون میری عیادت کیلئے آتا ہے۔ وہ اپنی ہی تکلیفوں میں اسقدر محو رہتا ہے کہ کسی دوسری بات کا خیال ہی اُسکے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ مگر جب اُسے صحت ہو جاتی ہے تو اپنے تیمارداروں کی توجہ اور پریشانی سرگرمی اور جانفشانی کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اور اُسکے دل میں اُنکی محبت اور عزت زیادہ ہو جاتی ہے۔ بعینہ یہی حال برج رانی کا تھا۔ جب تک وہ خود آزار دل میں مبتلا تھی کملاچرن

کی حیرانیوں اور پریشانیوں کا اندازہ نہ لگا سکتی تھی - اسمیں شک نہیں کہ وہ اُسکی خاطرداری میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھتی تھی مگر یہ خاطرداریاں ایک فرضی انتقام کے خیال سے ہوتی تھیں - نہ کہ سچی محبت سے - لیکن جب اُسکے جگر سے غم کا کانٹا نکل گیا تو کملا کی وہ داد و دہش اور سرگرمیاں یاد آئیں - اور یہہ فکر پیدا ہوئی کہ ان عنایات بیکراں کا جواب کیونکر دوں - میرا دھرم تھا کہ اپنی ذات سے انھیں آرام پہونچاتی - مگر آرام کا تو کیا ذکر - میں تو اُلٹے انکی جان کا گاہک ہوئی ہوں - وہ تو ایسے سچے دل سے میری محبت کریں - اور میں اپنے فرایض بھی ادا کر سکوں - ایشور کو کیا مُنہ دکھاؤنگی سچی محبت کا کنول اکثر اوقات احسان کے اثر سے کِھل جایا کرتا ہے - جہاں حسن و شباب - دولت و جاہ - اور محاسن ذاتی محبت کا بیج بونے میں ناکام رہتے ہیں - وہاں اکثر احسان کا جادو چل جاتا ہے - کوئی دل ایسا سخت اور سرد نہیں ہو سکتا جو سچی خدمت کے احسان سے پگھل نہ جائے

کملا اور برج رانی میں روز بروز اخلاص اور پیار بڑھنے لگا - ایک بندۂ محبت تھا اور دوسری کنیز فرض - ممکن نہ تھا کہ برج رانی کی زبان سے کوئی بات نکلے - اور کملا جان اُسکے پورے کرنے کی دل و جان سے کوشش نکرے - اب اُسکی محنت اور لیاقت انھیں کوششوں میں صرف ہوتی تھی - پڑھنا صرف والدین کو دھوکہ دینے کا ایک وسیلہ تھا - وہ ہمیشہ اُسکی طبیعت کا رنگ پرکھتا رہتا - اور اس اُمید پر کہ یہہ کام اُنکی خوشی کا باعث ہوگا وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا - ایک روز اُسنے مادھوی کو پھلواڑی میں پھول چُنتے دیکھا - یہہ چھوٹا سا باغیچہ مکان کے پشت پر واقع تھا - مگر چونکہ کنبہ کے کسی فرد کو اُس سے دلی ہمدردی نہ تھی - اسلئے بارھوں مہینے اُسپر خزاں کا دور رہتا تھا - برج رانی کو بوٹوں سے خلقی محبت تھی - پھلواڑی کی یہہ درگت دیکھی تو مادھوی کو

تاکید کی کہ کبھی کبھی اسمیں پانی دیدیا کرو۔ رفتہ رفتہ باغچہ کی حالت کچھ کچھ سنبھل چلی۔ اور بعض بعض پودھوں میں پھول نظر آنے لگے۔ کملا چرن کے لئے اتنا اشارہ کافی تھا۔ دل وجان سے باغچہ کے سنوارنے پر تُل گیا۔ دو ہوشیار مالی نوکر رکھ لئے۔ قسم قسم کے خوشرنگ پھول اور پودھے لگائے جانے لگے۔ انواع واقسام کی گھاسیں اور پتیاں گملوں میں سجائی جانے لگیں۔ چمن اور روشیں درست ہونے لگیں۔ جابجا لتائیں چڑھادی گئیں۔ کملا چرن دن دن کے دن کتاب ہاتھ میں لئے باغچہ میں ٹہلتا رہتا اور مالیوں سے باغچہ کی بناوٹ اور سجاوٹ کی تاکید کرتا رہتا۔ اور صرف اسلئے کہ برجن خوش ہو گی۔ ایسے بندۂ رضا کا جادو کسپر نہ چل جائیگا۔ ایک روز کملا نے کہا آؤ تمھیں باغچہ کی سیر کراؤں۔ برج رانی تیار ہو گئی۔

چاند نکل آیا تھا۔ اور اُسکی زرد روشنی میں پھول اور پودھے بہت سہانے معلوم ہوتے تھے۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی اور موتئے اور بیلے کی لپٹیں دماغ کو معطر کئے دیتی تھیں۔ ایسے وقت میں برجن ایک ملگجی ریشمی ساڑی اور ایک نفیس مخملی سلیپر پہنے روشوں میں ٹہلتی نظر آئی۔ اُسکے چہرے کی ملاحت پھولوں کو شرمندہ کر رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پھول کی دیوی ہے۔ کملا چرن بولے آج محنت سپھل ہو گئی۔

جیسے قمقمے میں گلال بھرا ہوتا ہے۔ اُسی طرح برج رانی کی آنکھوں میں محبت کا رس بھرا ہوا تھا۔ وہ مسکرائی مگر زبان سے کچھ نہ بولی۔

کملا ”مجھ جیسا خوش نصیب آدمی دنیا میں نہو گا“

برجن ”کیا مجھ سے بھی زیادہ ؟“

کملا متوالا ہو رہا تھا۔ برجن کو پیار سے گلے لگا لیا۔

کچھ دنوں تک روزانہ یہی معمول رہا۔ اسی اثنا میں تازہ دلچسپیوں کے سامان پیدا ہو گئے۔ رادھا چرن نے تصویروں کا ایک خوبصورت البم برجن کے پاس بھیجا۔ اسمیں کئی تصویریں چندرا کی بھی تھیں کہیں وہ بیٹھی شیاما کو پڑھا رہی ہے۔ کہیں بیٹھی ہوئی خط لکھ رہی ہے۔ اسکی ایک تصویر مردانہ لباس میں بھی تھی۔ رادھا چرن فوٹوگرافی کے فن سے واقف تھے۔ برجن نے یہ البم بہت پسند کیا۔ پھر کیا تھا کملا کو دھن سوار ہوئی کہ میں بھی تصویر کشی میں مہارت حاصل کروں۔ اور برجن کی تصویر کھینچوں۔ بھائی کے پاس لکھ بھیجا کہ کیمرا اور دوسرے ضروری سامان میرے پاس بھیج دیجئے۔ اور مشق شروع کر دی۔ گھر سے چلتے کہ مدرسے جا رہا ہوں۔ اور بیچ میں ایک پارسی فوٹوگرافر کی دوکان پر آ بیٹھتے۔ تین چار مہینہ کی محنت اور کوشش میں اس فن سے پوری واقفیت ہو گئی۔ مگر ابھی تک گھر پر کسی کو یہ راز معلوم نہ تھا۔ کئی بار برجن نے پوچھا بھی کہ آجکل دن بھر کہاں غائب رہتے ہو۔ تعطیل کے دن بھی نہیں نظر آتے۔ مگر کملا چرن نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔

ایک روز کملا چرن کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ برجن کے جی میں آئی لاؤ پرتاپ چندر کو ایک خط لکھ ڈالوں۔ مگر صندوق کھولا تو چٹھی کا کاغذ ندارد۔ مادھوی سے کہا جا کر اپنے بھیا کے ڈسک میں سے تھوڑا سا کاغذ نکال لا۔ مادھوی دوڑی ہوئی گئی تو اُسے ڈسک پر تصویروں کا البم کھلا ہوا ملا۔ اُسنے البم اُٹھا لیا اور اندر آ کر برجن سے بولی "بہن دیکھو یہہ تصویر ملی"

برجن نے اُسے شوق سے ہاتھ میں لیلیا۔ اور پہلا ہی ورق اُلٹا تھا کہ اچنبھا سا ہو گیا۔ وہ اُسیکی تصویر تھی۔ وہ اپنی پلنگ پر چادر اوڑھے۔ نیند میں مست پڑی تھی۔

بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور ایک ایک عضو سے بے تکلفی ٹپکتی تھی ہونٹوں پر
ایک دلپذیر مسکراہٹ کا جلوہ تھا۔ گویا کوئی دلپسند خواب دیکھ رہی ہے۔ تصویر کے
نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا "خواب ناز"۔ برجن حیرت میں تھی کہ میری ایسی تصویر
انھوں نے کیسے کھنچوائی۔ اور کس سے کھنچوائی۔ کیا کسی فوٹو گرافر کو اندر لائے ہونگے۔
نہیں ایسی شرارت بھلا کیا کریں گے۔ کیا تعجب ہے خود ہی سیکھ لیا ہو۔ ادھر مہینوں سے
بہت مشغول بھی تو ہیں۔ اگر خود ایسی عمدہ تصویر کھینچی ہے تو واقعی قابل تعریف کام کیا
ہے۔ دوسرا ورق اُلٹا تو وہ بھی اپنی ہی تصویر۔ وہ ایک ساڑی پہنے سب بے تکلفی سے
آدھے سر تک آنچل ڈالے۔ سیر چمن میں مصروف تھی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔
"سیر باغ"۔ تیسرا ورق اُلٹا تو وہ بھی اپنی ہی تصویر تھی۔ وہ باغیچہ میں زمین پر بیٹھی ہار گوندھ
رہی ہے۔ ڈھیروں پھول ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ اور مادھوی دوڑ دوڑ پھول چن
رہی ہے۔ یہہ تصویر تینوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ کیونکہ مصور نے اسمیں بڑی صفائی
سے قدرتی رنگ بھرے تھے۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا "البیلی مالن"۔ اب برجن
کو خیال آیا۔ کہ ایک روز جب میں ہار گوندھ رہی تھی تو کملا چرن نیل کانٹے کی جھاڑی سے
مسکراتے ہوئے نکلے تھے۔ ضرور اُسی دن یہہ تصویر کھینچی ہو گی۔ چوتھا ورق الٹا تو ایک
نہایت لطیف اور دلکش منظر دکھائی دیا۔ ایک شفاف پانی کا چشمہ تھا۔ اور اُسکے دونوں
کناروں پر جہانتک نگاہ پہونچتی تھی۔ گلاب کے تختے نظر آتے تھے۔ اُنکے نازک پھول ہوا
کے جھونکوں سے لچکے جاتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قدرت نے سبز آسمان میں
سُرخ تارے ٹانک دئے ہیں۔ یہہ کسی انگریزی تصویر کی نقل معلوم ہوتی تھی۔ البم کے
اور صفحے ابھی سادہ تھے۔

برجن نے اپنی تصویریں دوبارہ دیکھیں۔ اور اُس نخوت آمیز مسرت کے ساتھ جو ہر پری پیکر کو اپنے حُسن پر ہوتی ہے البم کو چھپاکر رکھ دیا۔ شام کو کملا چرن نے آکر دیکھا تو تصویریں غائب تھیں۔ ہوش اُڑ گئے۔ وہ اُسکے کئی مہینہ کی جگر کاویکا ثمرہ تھیں اور اُسے اُمید تھی کہ البم تحفہ میں دیکر برجن کے دیدۂ و دل میں اور بھی گھر کرلونگا۔ بہت پریشان ہوا۔ اندر جاکر برجن سے دریافت کیا تو اُسنے صاف انکار کردیا۔ بیچارہ گھبرایا ہوا اپنے دوستوں کے گھر گیا کہ شائد اُنمیں سے کوئی اُٹھا لیگیا ہو۔ مگر وہاں بھی بجز پھبتیوں کے اور کچھ ہاتھ نہ لگا۔ آخر جب حضرت بہت زچ ہوگئے تو شام کے وقت برجن نے البم کا پتہ بتلایا۔ اسی طرح دن لُطف سے گذر رہے تھے۔ آپسمیں چھیڑ چھاڑ اور مزے مزے کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ دونوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ میدان الفت میں میں آگے نکل جاؤں۔ مگر دونوں کی محبتوں میں فرق تھا۔ کملا چرن غلبۂ محبت میں اپنے کو بالکل بھول گیا تھا۔ برعکس اسکے برجن کی محبت فرض کی بنیاد پر قائم تھی۔ ہاں یہ خوشگوار فرض تھا۔ جسے محبت کی چاشنی نے بہت پُرلذت بنا دیا تھا۔

تین سال اور گذر گئے۔ یہ اُنکی زندگی کے تین مبارک سال تھے۔ چوتھے سال کا آغاز ایام مصیبت کی ابتدا تھی۔ بعض ہستیوں کو قدرت کی جانب سے دنیا کی نعمتیں اور کامرانیاں اس بہتات سے ملتی ہیں کہ اُنکے لئے دن سدا ہولی۔ اور رات سدا دیوالی رہتی ہے مگر کتنی ہی ایسی بدقسمت ہستیاں بھی ہیں جنکا پیمانۂ مسرت چھوٹا اور چھچھلا ہوتا ہے۔ ایسا چھوٹا کہ آنکھوں میں نشہ کی سُرخی آنے سے پہلے ہی جام خالی ہو جاتا ہے۔ اور مسرت کے چند لمحے زندگی کی سیاہ گھٹا میں ایکبار بجلی کی طرح کوند کر ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ جاتے ہیں۔ برج رانی انھیں بدقسمتوں میں تھی۔ بسنت کی رُت تھی۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں

سردی اس غضب کی پڑتی تھی کہ کنوؤں کا پانی جم جاتا تھا۔ اسوقت شہر میں طاعون کا دورہ ہوا۔ ہزاروں آدمی اُسکی نذر ہونے لگے۔ ایک روز شدت کا بخار آیا۔ ایک گلٹی نکلی۔ اور مریض راہی عدم ہو گیا۔ گلٹی کا نکلنا گویا موت کا پروانہ تھا۔ کیا حکیم۔ کیا ڈاکٹر کسی کا علاج کارگر نہیں ہوتا تھا۔ سیکڑوں گھر بے چراغ ہو گئے۔ ہزاروں بچے یتیم۔ اور ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ جسکے جدھر سینگ سمائے اُدھر بھاگ نکلا۔ ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کا ہمدرد اور غمخوار نہ تھا۔ والدین بچوں کو چھوڑ کر بھاگے۔ عورتیں مردوں سے کنارہ کش ہو گئیں۔ گلیوں میں۔ سڑکوں پر۔ مکانوں میں جدھر دیکھئے لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دوکانیں بند ہو گئیں۔ دروازوں میں قفل پڑ گئے۔ ہر طرف خاک اڑتی تھی۔ مشکل سے کوئی جاندار چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا۔ اور اگر کوئی ضرورت سے مجبور ہو کر گھر سے نکل پڑا تو وہ ایسی تیزی سے قدم اُٹھاتا تھا گویا موت کا سپاہی اُسکے تعاقب میں ہے۔ ساری بستی ویران ہو گئی۔ اگر آباد تھا تو قبرستان۔ یا شمشان۔ چوروں اور رہزنوں کی بن آئی۔ دن دھاڑے قفل ٹوٹتے تھے۔ اور آفتاب کی روشنی میں سیندھیں پڑتی تھیں۔ جو لوگ طاعون سے بچے اُنھیں فاقوں نے آدبوچا۔ غرض عجیب مصیبت کا سامنا تھا۔

بابو شیاما چرن بہت مضبوط دل کے آدمی تھے۔ مکان کے چاروں طرف محلے کے محلے خالی ہو گئے تھے۔ مگر وہ ابھی تک اپنے مکان میں بےخوف و خطر آباد تھے۔ مگر جب انکا ایک سائیس مر گیا تو سارے کنبے میں کھلبلی پڑ گئی۔ اور دیہات چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ منشی جی نے اُسی ضلع میں چند گانوں خرید لئے تھے۔ اور مجگانوں نامی ایک موضع میں ایک وسیع مکان بنوا رکھا تھا۔ اُنکا ارادہ تھا کہ پنشن پانے پر یہیں

بود و باش اختیار کروں گا۔ کاشی چھوڑکر آگرہ میں کون مرنے جائے۔ برجن نے یہ تجویز سُنی تو بہت خوش ہوئی۔ دیہاتی زندگی کے روشن پہلو اُسکے آنکھوں میں پھر رہے تھے۔ ہرے بھرے درخت۔ اور سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت۔ ہرنوں کے جھنڈ۔ اور چڑیوں کا چہچہانا۔ یہہ بہاریں لوٹنے کے لئے اُسکا دل بیقرار ہو رہا تھا۔ کملا چرن بھی شکار کھیلنے کے لئے بندوق صاف کرنے لگے۔ مگر یکایک منشی جی نے اُسے بلاکر کہا کہ تم الہ آباد جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ پرتاپ چندر وہاں تمہارا نگراں رہیگا۔ دیہات میں اوقات ضائع کرنے سے کیا حاصل۔ اتنا سننا تھا کہ کملا چرن کی نانی مرگئی۔ الہ آباد جانے سے صاف صاف انکار کر بیٹھا۔ بہت دیر تک منشی جی اُسے سمجھاتے رہے۔ مگر وہ جانے کے لئے تیار نہوا۔ آخر اُنکی ان آخری الفاظ نے فیصلہ کر دیا "تمہارے مقسوم میں علم لکھا ہی نہیں ہے۔ میری حماقت ہے کہ اُس سے لڑتا ہوں"

برج رانی نے جب یہہ تازہ تجویز سنی تو اُسے بھی بہت رنج ہوا۔ عورت کے مزاج میں خود بینی کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ بُواز عفران کے دل میں بھی اپنی خوبصورتی کی تعریف سنکر گدگدی پیدا ہونے لگتی ہے۔ برج رانی اب بھی سمجھتی تھی کہ کملا کا دھیان پڑھنے میں نہیں لگتا۔ مگر یہہ تغافل اب اُسے ناگوار نہ معلوم ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات اُسکا جی چاہتا کہ آج یہہ مدرسے نہ جاتے تو اچھا ہوتا۔ کملا کی محبت آمیز آواز اُسکے کانوں کو بہت پیاری معلوم ہوتی۔ مگر جب اُسے یہہ معلوم ہوا کہ کملا نے الہ آباد جانے سے صاف انکار کیا۔ اور لالہ جی بہت سمجھا رہے ہیں تو اسے اور بھی رنج ہوا۔ اُسے کچھ دنوں تک تنہا رہنا گوارا تھا۔ بجائے اِسکے کہ کملا کو اپنے والد کی نافرمانی کرتے دیکھے۔ مادھوی کو بھیجا کہ اپنے بھیا کو بلا لا۔ مگر کملا نے جگہہ سے ہلنے کی قسم کھا لی تھی۔ سوچتا کہ اندر جاؤں گا تو وہ ضرور

الہ آباد جانے کے لئے زور دیگی۔ اُسے کیا خبر کہ یہاں دل پر کیا بیت رہی ہے۔ کاش
اسکا دل مجھے مل جاتا۔ یوں بات چیت میں تو قند و شکر گھولدیتی ہے۔ مگر جب کبھی محبت
کے امتحان کا موقع آجاتا ہے تو فرض اور مصلحت کے پردہ میں مُنہ چھپانے لگتی ہے۔
حق یہہ ہے کہ عورتوں میں وفا کی بو ہی نہیں ہوتی۔

جب رات زیادہ گذر گئی۔ اور کملا جگہہ سے نہ ہلا تو برج رانی خود آئی۔ اور بولی "کیا آج گھر میں جانے کی قسم کھالی ہے۔ راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں"

کملا۔ "اندر جاتے ڈر معلوم ہوتا ہے"

برجن۔ "اچھا چلو میں ساتھ ساتھ چلتی ہوں۔ اب تو نہ ڈروگے"

کملا۔ "مجھے الہ آباد جانے کے لئے حکم ہوا ہے"

برجن۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلونگی"

یہہ کہکر برجن نے کملا کی طرف آنکھیں اُٹھائیں۔ اُنمیں انگور کے خوشے لگے ہوئے تھے۔ کملا ہار گیا۔ ان موہنی آنکھوں میں آنسو دیکھکر کسکا جگر تھا جو اپنی ضد پر قائم رہے۔ کملا نے اُسے گلے لگا لیا اور بولے "میں جانتا تھا کہ تم جیت جاؤگی۔ اسی لئے اندر نہ جاتا تھا"

ساری رات محبت کی الوداعی باتیں ہوتی رہیں۔ بار بار محبت کی نگاہیں ہم آغوش ہوتیں گویا وہ پھر کبھی نہ ملینگی۔ افسوس! یہہ جدائی آخری ملاقات تھی۔ برجن نے پھر کملا کی صورت نہ دیکھی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ قسمت ہمیں ہمیشہ کے لئے جدا کر رہی ہے۔

اٹھارھویں فصل

برجن کے خطوط کملا کے نام

(۱)

پیارے محبت نامہ آیا۔ سر اور آنکھوں سے لگایا۔ ایسے خط تم نہ لکھا کرو کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میں لکھوں تو مضائقہ نہیں۔ یہاں طبیعت سخت گھبرا رہی ہے کیا سنتی تھی اور کیا دیکھتی ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے پھونس کے جھونپڑے۔ ایک ایک بالشت کی بوسیدہ دیواریں۔ گھروں کے سامنے کوڑے کرکٹ کے بڑے بڑے ڈھیر کیچڑ میں لپٹی ہوئی سوریں۔ دبلی پتلی مریل گائیں۔ یہ سب نظارہ دیکھ کر جی چاہتا ہے کہیں چلی جاؤں۔ آدمیوں کو دیکھو تو خستہ حال۔ ہڈیاں نکلی ہوئی۔ پریشانی کی مورت۔ افلاس کی زندہ تصویر۔ کسی کے بدن پر ثابت کپڑا نہیں۔ کیسے قسمت کے کھوٹے کہ رات دن پسینہ بہانے پر بھی کبھی بھر پیٹ روٹیاں نصیب نہ ہوں۔ ہمارے مکان کے پچھواڑے ایک چھوٹی سی گڑھیا ہے۔ مادھوی کھیلتی تھی پیر پھسلا تو پانی میں گر پڑی۔ یہاں مشہور ہے کہ اس گڑھیا میں چڑیلیں نہانے آیا کرتی ہیں۔ اور وہ خواہ مخواہ راہ چلتوں کو چھیڑتی ہیں۔ اسی طرح دروازہ پر ایک پیپل کا تناور درخت ہے۔ وہ بھوتوں کا بسیرا ہے۔ پیپل کے بھوتوں اور گڑھیا کی چڑیلوں میں بہت راہ و رسم ہے۔ گڑھیا کا تو خیر بہت خوف نہیں مگر اس کمبخت پیپل کا خوف سارے گاؤں کے دلوں پر ایسا چھایا ہوا ہے کہ

کہ سرِ شام ہی سے راستہ بند ہو جاتا ہے۔ لڑکے اور عورتیں تو اُدھر قدم ہی نہیں
رکھتیں۔ ہاں اکا دکا مرد کبھی کبھی گذر جاتا ہے۔ مگر وہ بھی گھبرایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ دو مقام تو گویا ان
پلید روحوں کے مرکز ہیں۔ ان کے علاوہ صدہا بھوت چڑیل مختلف مقامات میں آباد
پائے جاتے ہیں۔ معتبر روایتیں ہیں کہ چڑیلیں نظر آتی ہیں۔ گاؤں والوں نے ان کے
مزاج پہچان رکھے ہیں۔ کسی بھوت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ سر چڑھتا ہے تو مہینوں
تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اور کوئی دو ایک دن میں پوجا لیکر الگ ہو جاتا ہے۔ گاؤں والوں میں ان
امور پر اس طرح باتیں ہوتی ہیں۔ گویا یہ بدیہی واقعات ہیں یہاں تک سنا گیا ہے کہ چڑیلیں
کھانا مانگنے اور پانی پینے آیا کرتی ہیں۔ انکی ساڑیاں عموماً بگلے کی پر کی طرح صاف ہوتی ہیں۔
اور باتیں کسی قدر ناک میں کرتی ہیں۔ ہاں گہنے کا استعمال انکی قوم میں رائج نہیں۔ انکی زد
میں آجانے کا خطرہ اُن جوان عورتوں کو ہوتا ہے جو بناؤ سنگار کئے۔ رنگین کپڑے پہنے
اکیلی نظر آجائیں۔ پھولوں کی باس انکو بہت پسند ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی عورت یا لڑکا
دوپہر کو یا رات کو اپنے پاس پھول رکھکر سو سکے۔

بھوتوں کے رتبہ اور اعزاز کا امتیاز دانائی سے کیا گیا ہے۔ جوگی بابا آدھی رات کو
کالی کملیا اوڑھے۔ کھڑاؤں پر سوار۔ گاؤں کے چاروں طرف گھومتے ہیں۔ اور بھولے
بھٹکے مسافروں کو راستہ بتلاتے ہیں۔ سال بھر میں ایک بار انکی پوجا ہوتی ہے۔ وہ اپنے
بجائے بھوتوں کے دیوتاؤں کے زمرہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ کسی آفت کو بھی
گاؤں کے اندر قدم نہیں رکھنے دیتے۔ اسکے برعکس ہردی بابا سے بچہ بچہ تھراتا ہے۔
جس درخت پر انکی بود و باش ہے اُدھر سے اگر کوئی چراغ جلنے کے بعد نکل جائے تو اسکے
جان کی خیر نہیں۔ انھیں بھگانے کے لئے دو بوتل شراب کافی ہے۔ انکا [illegible]

کے دن اس درخت کے تلے گانجہ اور چرس رکھ آتا ہے۔ ایک لالہ صاحب بھی بھوت بن بیٹھے ہیں۔ یہ ذات شریف پٹواری تھے۔ انھیں چند ستم زدہ اسامیوں نے قتل کر ڈالا تھا۔ انکی پکڑ وہ بلا کی پکڑ ہے کہ بلا جان لیئے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کوئی پٹواری یہاں سال بھر سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم کہوگے کہ یہ کہاں سے بھوت چڑیل کا بکھڑا لے بیٹھی۔ میں کیا کروں۔ گانوں سے ذرا فاصلہ پر ایک درخت ہے۔ اسپر مولوی صاحب قیام فرماتے ہیں۔ وہ بیچارے کسی کو نہیں چھیڑتے۔ ہاں جمعرات کے روز جمعراتی نہ پہونچ جائے تو بچوں کو ستانے لگتے ہیں۔

کیسی جہالت ہے! کیسی وہم پرستی! یہ خیالات ان لوگوں کے خمیر ہو گئے ہیں۔ بچہ بیمار ہوا اور بھوت کی پوجا ہونے لگی۔ کھیت کھلیان میں بھوت کا حصہ۔ شادی بیاہ میں بھوت کا حصہ۔ جہاں دیکھیئے بھوت ہی بھوت نظر آتے ہیں۔ یہاں نہ دیوی ہیں۔ نہ دیوتا۔ بھوتوں کا راج ہے۔ جمراج یہاں قدم نہیں رکھ سکتے۔ روحیں بھوت ہی قبض کرتے ہیں۔ ان خیالات کی کیونکر اصلاح ہوگی۔ اور کیا لکھوں۔

تمہاری برجن

(۲)

مجگانوں۔

پیارے شکر ہے بعد مدت کے تمہاری پریم پتری ملی۔ کیا سچ مچ خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ خط کیا لکھا ہے گویا بیگار ٹالی ہے۔ تم میں تو یہ عادت نہ تھی۔ کیا وہاں جاکر کچھ اور ہو گئے۔ تمھیں یہاں سے گئے دو ماہ سے زائد ہوتے ہیں۔ اس درمیان میں کئی چھوٹی بڑی تعطیلیں پڑیں۔ مگر تم نہ آئے۔ تم سے ہاتھ جوڑکر کہتی ہوں ہولی کی تعطیل میں

ضرور آنا اگر ابکی ترسایا تو مجھے ہمیشہ شکایت رہیگی۔

یہاں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی دوسری دنیا میں آگئی ہوں۔ رات کو سوتی تھی کہ یکایک ہا ہا ہو ہو کا غل سنائی دیا۔ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ لڑکے گھر گھر سے لکڑی اور اُپلے وصول کرتے پھرتے ہیں۔ ہولی ماتا کی یہی خوراک ہے۔ یہ طوفان بے تمیزی جہاں پہونچگیا ایندھن کا ستھراؤ ہو گیا۔ کسی کی مجال نہیں ہے جو اس فوج کو روک سکے۔ ایک نمبردار کی منڈیا غائب ہو گئی۔ اسمیں دس بارہ بیل آسانی سے بندھ جاتے تھے۔ ہولی والے کئی دن سے تاک میں تھے۔ موقع پاکر اُڑا لیگئے۔ ایک کُرمی کا جھونپڑا اڑگیا۔ کتنے ہی اُپلو لاپتہ ہو گئے۔ لوگ اپنی لکڑیاں گھروں میں بھرے لیتے ہیں۔ لالہ جی نے ایک پیڑ ایندھن کے لئے مول لیا تھا۔ آج رات کو وہ بھی ہولی ماتا کے منہ میں چلا گیا۔ دو تین گھروں کے کواڑ اُتر گئے۔ پٹواری صاحب دروازہ پر سو رہے تھے۔ انھیں زمین پر ڈھکیل کر لوگ چارپائی لے بھاگے۔ چو طرفہ ایندھن کی لوٹ مچی ہوئی ہے۔ جو چیز ایک بار ہولی ماتا کے مُنہ میں چلی گئی اُسے پھیر لانا بڑا بھاری گناہ ہے۔ پٹواری صاحب نے بڑی دھمکیاں دیں۔ میں جمعبندی بگاڑ دونگا۔ خسرہ غلط لکھ دونگا۔ مگر کچھ اثر نہوا۔ یہاں کا قانون رسمی ہے کہ ان دنوں ہولی والے جو چیز پا جائیں بلا مزاحمت لے جائیں۔ کون کسکی فریاد کرے۔ نوجوان بیٹا اپنے باپ کی آنکھ بچا کر اپنی ہی چیز اُٹھوا دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنی جماعت میں ذلیل سمجھا جاتا ہے۔

فصل تیار ہو گئی ہے۔ مگر کاٹنے میں دو ہفتہ کی کسر ہے۔ میرے دروازہ پر سے میلوں کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ گیہوں اور جو کے سنہرے کھیتوں کے کنارے کنارے کسم کے سُرخ اور زعفرانی پھولوں کا حاشیہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ طوطے چوطرف منڈلایا کرتے ہیں۔

مادھوی سے نے یہاں کئی سکھیاں بنا رکھی ہیں۔ پڑوس میں ایک اہیر رہتا ہے۔ رادھا نام ہے۔ پار سال ماں باپ طاعون کے شکار ہو گئے۔ گرہستی کا کل بار اُسی کے سر پر ہے۔ اُسکی بیوی تلسا ہمارے یہاں اکثر آتی ہے۔ خوبصورت نک سک سے درست عورت ہے۔ بات چیت کرنے میں شرما جاتی ہے۔ بھولی اتنی کہ جی چاہتا ہے گھنٹوں اسکی باتیں سُنا کیجے۔ مادھوی نے اس سے بہنا پا کر رکھا ہے کل اُنکی گڑیوں کا بیاہ ہے۔ تلسی کی گڑیا ہے اور مادھوی کا گڈا سُنتی ہوں بیچاری بہت غریب ہے۔ مگر میں نے اُسکے چہرے پر کبھی میل نہیں دیکھی۔ کہتی تھی کہ اُپلے بیچ کر دو روپیہ جمع کر لیا ہے۔ ایک روپیہ جہیز دیگی۔ اور ایک روپیہ میں براتیوں کا کھانا پینا ہوگا۔ گڑیا کے گہنے کپڑے کا بوجھ رادھا کے سر ہے۔ کیسی سادہ قناعت سے بھری ہوئی معاشرت ہے!

لو اب رخصت ہوتی ہوں۔ تمہارا وقت بکواس سننے میں ضائع ہوا۔ معاف کرنا۔ تمہیں خط لکھنے بیٹھتی ہوں تو قلم ہی نہیں رکتا۔ ابھی بہتیری باتیں لکھنے کو پڑی ہیں۔ پرتاپ چند سے میرا پا لاگن کہدینا۔

تمہاری برجن

(۴۳)

چُنگانوں۔

پیارے۔ تمہارا محبت نامہ ملا۔ سینہ سے لگایا۔ خوب! چوری اور سینہ زوری۔ اپنے نہ آنے کا الزام میرے سر رکھتے ہو۔ میرے دل سے کوئی پوچھے کہ اُسے تمہارے دیدار کی کتنی آرزو ہے۔ اب یہ تمنا روز بروز اضطراب کی صورت پکڑتی جاتی ہے کبھی کبھی بیچین ہو جاتی ہوں۔ میری یہ حالت تھوڑے ہی دنوں سے ہونے لگی ہے۔ جس وقت یہاں سے

گئے ہو مجھے معلوم نہ تھا کہ وہاں جاکر میری دلیل کروگے۔ خیر تمھیں سچ اور میں ہی جھوٹ۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے میرے دونوں خط پسند کئے۔ مگر پرتاپ چندر کو ناحق دکھائے۔ وہ حالات بالکل قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ غلطیاں رہ گئیں ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ پرتاپ نے اُنھیں بہت قیمتی سمجھا اگر وہ میرے خطوط کی اتنی وقعت سمجھتے ہیں کہ اُنکے سہارے سے ہماری دیہاتی معاشرت پر کوئی دلچسپ مضمون لکھ سکیں تو میں اپنے تئیں بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں۔

کل یہاں دیوی جی کی پوجا تھی۔ ہل۔ چکّی۔ پُر۔ چولھے سب بند تھے۔ دیوی جی کا ایسا ہی حکم ہے۔ انکے حکم کی نافرمانی کون کرے۔ حقّہ پانی بند ہوجائے۔ سال بھر میں یہی ایک دن ہے جسے گاؤں والے بھی تعطیل سمجھتے ہیں۔ ورنہ ہولی دیوالی بھی روزمرہ کے ضروری کام نہیں بند کرسکتیں۔ بکرا چڑھا۔ ہون ہوا۔ ستّو کھلایا گیا۔ اب گاؤں کے بچہ بچہ کو یقین کامل ہے کہ طاعون کا دورہ یہاں نہ ہوسکیگا۔ یہہ سب تماشہ دیکھکر سوئی تھی۔ قریب بارہ بجے ہونگے کہ سیکڑوں آدمی ہاتھوں میں مشعلیں لئے۔ غل مچاتے نکلے اور سارے گاؤں کا پھیرا کیا۔ جسکے معنی یہہ ہیں کہ بیماری اس حد کے اندر قائم نہ رکھ سکیگی۔ ملوان کے ختم ہونے پر چند آدمی دوسرے گاؤں کے حدود میں گھس گئے۔ اور تھوڑا سا پھول۔ پان چاول لونگ وغیرہ چیزیں زمین پر رکھدیں۔ یعنی اپنے گاؤں کی بلا دوسرے گاؤں میں ٹالدی۔ جب یہہ لوگ اپنا کام پورا کرکے چلنے لگے تو اُس گاؤں والوں کو سُن گن لگگئی۔ سیکڑوں آدمی لاٹھی لے لیکر چڑھ دوڑے۔ اور دونوں فریق میں خوب مارپیٹ ہوئی۔ اسوقت گاؤں کے کئی آدمی ہلدی پی رہے ہیں۔

آج سویرے کل کے بچے کھچے رسوم ادا کئے گئے۔ جسے یہاں کی اصطلاح میں

کڑھائی دینا کہتے ہیں۔ میرے دروازہ پر ایک بھٹا کھودا گیا۔ اور اُس پر ایک کڑاہ دودھ سے لبریز رکھا گیا۔ کاشی نام کا ایک بھر ہے۔ وہ بدن میں بھبوت رمائے آیا۔ گانوں کے آدمی ٹاٹ پر بیٹھے۔ سنکھ بجنے لگا۔ کڑاہ کے چاروں طرف مالا پھول بکھیر دیا گیا۔ جب کڑاہ میں خوب اُبال آیا تو کاشی یکایک اُٹھا اور جے کالی جی کی! کہکر کڑاہ میں کود پڑا۔ میں تو سمجھی اب یہ زندہ نہ نکلیگا۔ مگر پانچ منٹ کے بعد کاشی نے پھر جست ماری۔ اور کڑاہ کے باہر تھا۔ اُسکا بال بھی بیکا نہوا۔ لوگوں نے اُسے مالا پہنایا۔ اور ہاتھ جوڑکر پوچھنے لگے مہراج اگلی سال فصل کیسی ہوگی۔ پانی کیسا برسیگا۔ بیماری آئیگی یا نہیں۔ گانوں کے لوگ خیریت سے رہیں گے؟ گڑ کا بھاؤ کیسا رہے گا۔ وغیرہ۔ کاشی نے ان سب سوالوں کے جواب صاف صاف مگر ذرا مجذوبانہ الفاظ میں دیئے۔ اسکے بعد مجلس برخاست ہوئی۔ سنتی ہوں یہہ جلسے ہر سال ہوا کرتے ہیں۔ کاشی کی پیشینگوئیاں سب سچی ثابت ہوتی ہیں۔ اور کبھی ایک آدھ غلط بھی نکل آئیں تو کاشی اُنکی تاویل بڑی خوبی سے کر دیتا ہے۔ کاشی کو ضمیر شناسی میں بڑا ملکہ ہے۔ گانوں میں کہیں چوری ہو کاشی اسکا پتہ لگا دیگا۔ جو کام پولیس کے بھیدیوں سے پورا نہو اُسے وہ پورا کر دیتا ہے۔ اور گو وہ ذات کا بھر ہے۔ مگر گانوں میں اُسکی بڑی عزت ہے۔ ان سب خدمات کا معاوضہ وہ بجز شراب کے اور کچھ نہیں لیتا۔ نام نکلوایئے مگر ایک بوتل اسکے نذر کیجئے۔ آپکا مقدمہ کچہری میں ہے۔ کاشی اُسکی فتح کی کوشش میں سرگرم ہے۔ بس اُسے ایک بوتل آب سُرخ دیجئے۔

ہولی کا زمانہ بہت قریب ہے۔ ایک ہفتہ سے زائد نہیں۔ اہا! میرا دل اسوقت کیسا باغ باغ ہو رہا ہے۔ دل میں مسرت آمیز گدگدی محسوس ہو رہی ہے۔ آنکھیں تمھیں

دیکھنے کے لئے بیقرار ہو رہی ہیں - یہ ہفتہ بڑی مشکلوں سے کٹے گا - اور تب! میں اپنے پیا کا درشن پاؤنگی -

تمہاری پیاری برجن

(۴)

مجگا لوں -

پیارے! تم ظالم ہو - سنگدل ہو - بیوفا ہو - بیرحم ہو بے درد ہو - جھوٹے ہو - اور میں تمھیں کیا گالیاں دوں - اور کیا کوسوں کاش تم اسوقت میرے سامنے ہوتے تو اس سنگدلی کا جواب دیتی - میں کہہ رہی ہوں - تم دغا باز ہو - میرا کیا کر لوگے - نہیں آتے ہو مت آؤ - اگر میری صورت سے بیزار ہو بہتر - اگر میری جان لینے پر آئے ہو شوق سے لیلو - رُلانا منظور ہے رُلاؤ - مگر میں رؤں کیوں - میری بلا روئیے - جب آپ کو اتنا خیال نہیں کہ دو گھنٹہ کا سفر ہے ذرا اُسکی خبر لیتا آؤں - تو مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ روؤں - اور جان کھوؤں -

ایسا غصّہ آرہا ہے کہ خط چاک کر کے پھینکدوں - اور پھر تم سے بات نکروں - ہائے! تم نے میرے ارمان کیسے خاک میں ملائے ہیں - ہولی! ہولی! اس ایک لفظ میں میرے لئے جادو کا اثر تھا - کسی کے زبان سے نکلا اور میرے دل نے گُدگُدانا شروع کیا - مگر افسوس! ہولی گذر گئی - اور میں ناکام اور نامراد رہ گئی - پہلے یہہ لفظ سُنکر دل میں گُدگُدی ہوتی تھی - اب کلیجہ مسوستا ہے - اپنی اپنی قسمت ہے - گانوں کے بھوکے ننگے لنگوٹی میں پھاگ کھیلیں - خوشیاں منائیں - رنگ اُڑائیں - اور میں بیوگنی اپنی چارپائی پر سفید ساری پہنے پڑی رہوں - قسم لے لو جو اُسپر ایک سُرخ دھبہ بھی پڑا ہو - قسم لیلو

جو میں نے عبیر یا گلال ہاتھ سے چھوا ہو۔ میری عطر میں بسی ہوئی عبیر۔ کیوڑے میں گھولی ہوئی گلال۔ تکلف سے بنائے ہوئے پان۔ سب تمہاری بے مہری کا رونا رو رہے ہیں۔ مادھوی نے جب بہت ہٹ کی تو مینے ایک سُرخ ٹیکہ لگوا لیا۔ مگر آج سے اِن شکایتوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر پھر کوئی کلمہ شکایت زبان سے نکلے تو زبان کاٹ لینا۔

پرسوں سرِ شام ہی سے گانوں میں چہل پہل مچنے لگی۔ نوجوانوں کی ایک جماعت ہاتھ میں دف لئے گالی۔ مغلظات بکتی دروازے دروازے پھیرے لگانے لگی۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ آج یہاں اتنی گالیاں کھانی پڑینگی۔ شرمناک الفاظ اُنکے مُنہ سے ایسے بے تکلف نکلتے ہیں جیسے پھول جھڑتے ہوں۔ شرم و لحاظ کا نام نہ تھا۔ باپ بیٹے کے منہ پر۔ بیٹا باپ کے سامنے گالیاں بک رہا ہے۔ باپ للکار کر بہو سے کہتا ہے آج ہولی ہے۔ بہو گھر میں سر نیچا کئے سنتی ہے۔ اور مسکرا دیتی ہے۔ ہمارے پٹواری صاحب تو ایک ہی حضرت نکلے۔ آپ شراب میں مخمور۔ نشہ میں چور۔ ایک میلی سی لُٹیا سر پر رکھے اس جماعت کے پیشرو تھے۔ اُنکی بہو بیٹیاں بھی اُنکے مغلظات کی طغیانی سے بچ نہ سکیں۔ گالیاں کھاؤ اور دھنو۔ اگر چہرے پر ذرا بھی میل آئے تو لوگ سمجھیں اسکی محرّم کی پیدائش ہے۔ خوب رواج ہے!

تین بجے شب کے قریب یہہ جماعت ہولی ماتا کے پاس پہونچی۔ لڑکے آتشبازیاں چھوڑ رہے تھے۔ میں بھی کئی عورتوں کے ساتھ گئی۔ وہاں عورتیں ایک طرف ہولیاں گا رہی تھیں۔ آخر ہولی میں آگ لگانیکا وقت آیا۔ آگ لگتے ہی دم کی دم میں شعلے بلند ہوئے۔ اور سارا آسمان سُنہرے رنگ میں رنگ گیا۔ دور دور تک کے پیڑ پتے منور ہو گئے۔ اب اس آتش کدہ کے چاروں طرف لوگ ہولی ماتا کی جے چلا چلا کر دوڑنے لگے۔ سبھو نکے

ہاتھوں میں گیہوں اور جو کی بالیاں تھیں۔ جو وہ اس الاؤ میں پھینکتے جاتے تھے۔ جب شعلے بہت بلند ہو گئے تو لوگ ایک کنارے کھڑے ہو کر پھر "کبیر" کہنے لگے۔ دو گھنٹہ تک یہی کیفیت رہی۔ لکڑی کے کندوں سے چٹاخ پٹاخ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ مویشی اپنے اپنے کھونٹوں پر مارے ڈر کے چیخ رہے تھے۔ تُلسا نے مجھ سے کہا اِکی ہولی کی لَو ٹیڑھی جا رہی ہے۔ کُشل نہیں۔ جب لو سیدھی اُٹھتی ہے تو گاؤں میں سال بھر خوشی کا دور رہتا ہے۔ لیکن لو کا ٹیڑھا ہو جانا منحوس ہے۔ آخر شعلے تھمنے لگے۔ آنچ کی تیزی کم ہوئی تب کچھ لوگ الاؤ کے نزدیک آکر غور سے دیکھنے لگے۔ جیسے کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔ تُلسا نے بتلایا کہ جب بسنت کے دن ہولی کی بنیاد پڑتی ہے تو پہلے ایک ارنڈ گاڑ دیتے ہیں۔ اُسی پر لکڑی اور اُپلے کا ڈھیر لگایا جاتا ہے۔ اسوقت یہ لوگ اُسی ارنڈ کے پودھے کی تلاش کر رہے تھے۔ اُس شخص کا بہادروں میں شمار ہوتا ہے جو سب سے پہلے اس پودھے پر ایسا نشانہ لگائے کہ وہ ٹوٹ کر دور جا گرے۔ پہلے پٹواری صاحب پینترا بدلتے آئے۔ مگر وس گز کی دوری سے جھانک کر لوٹ گئے۔ تب رادھا ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹا لئے۔ دلیرانہ مستقل مزاجی سے آگے بڑھا اور آگ میں گھس کر وہ بھرپور ہاتھ لگایا کہ پودھا الگ جا گرا۔ لوگ اُن ٹکڑوں کو لوٹنے لگے۔ ماتھے پر اُس کا ٹیکہ لگاتے ہیں۔ اور اُسے متبرک سمجھتے ہیں۔

یہاں سے فرصت پاکر یہ مردانہ جماعت دیبی جی کی استھان کی طرف بڑھی۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ وہاں دیبی جی کا ادب کیا گیا ہوگا۔ آج وہ بھی گالیاں سُننا پسند کرتی ہیں۔ چھوٹے بڑے سب اُنھیں مغلظات سُنا رہے تھے۔ چند دن پہلے انھیں دیوی جی کی پوجا ہوئی تھی۔ حق یہ ہے کہ دیہات میں اسوقت ایشور کو گالی دینا بھی معاف ہے۔ ماں بہن کا تو

کہیں شمار ہی نہیں۔

سویرا ہوتے ہی لالہ جی نے مہراج سے کہا آج کوئی دو سیر بھنگ پسوالو۔ اُسکی دو قسمیں الگ الگ بنوالو۔ نمکین اور شیریں۔ مہراج نکلے۔ اور کئی آدمیوں کو پکڑ لائے بھنگ پسی جانے لگی۔ بہت سے کُلّھڑ منگا کر صفائی سے رکھے گئے۔ دو مٹکوں میں دونوں قسموں کی بھنگ بنائی گئی۔ پھر کیا تھا۔ تین چار گھنٹے تک شائقین کا تانتا لگا رہا۔ لوگ خوب تعریفیں کرتے۔ اور سر ہلا ہلا کر مہراج کی کارگذاریوں کی داد دیتے۔ جہاں کسی نے قدر دانی کی اور مہراج نے دوسرا کلّھڑ بھرا۔ اور بولے یہہ نمکین ہے۔ اسکا بھی سواد چکھ لو۔ اجی پی بھی لو۔ کیا روج روج ہولی آئیگی۔ کہ روج روج ہمارے ہاتھ کی بنی ہوئی بوٹی ملیگی۔ اسکے جواب میں کسان ایسی نگاہوں سے تاکتا ہے گویا کسی نے اُسے نعمت دیدی۔ اور ایک کے بدلے تین کُلّھڑ چٹ کر جاتا ہے۔ پٹواری کے داماد منشی جگدمبا پرشاد صاحب تشریف لائے ہیں۔ آپ کچہری میں عرائض نویس ہیں۔ اُنھیں مہراج نے اسقدر پلادی کہ آپے سے باہر ہوگئے اور ناچنے کودنے لگے۔ گاؤں کا گاؤں اُنھیں آماجگاہ ظرافت بنائے ہوئے تھا۔ ایک کسان آتا ہے اور انکی طرف مسکرا کر کہتا ہے ”تم یہاں ٹھاڑھی ہو۔ گھر جاکے کھانا پکاؤ۔ ہم آوت ہیں“ اسپر ایک فرمایشی قہقہہ پڑتا ہے۔ کاشی بھر دوہرالنتہ جمائے۔ لٹھ کندھے پر رکھے ہوئے آتا ہے اور حاضرین کی طرف نقلی غصہ سے دیکھکر گرجتا ہے ”مہراج! یہہ اچھی بات نہیں ہے کہ تم ہمرے نئی بہریا سے مجالوٹت ہو“ یہہ کہکر وہ منشی جی کو سینہ سے چمٹا لیتا ہے۔ منشی جی بیچارے مختصر آدمی۔ ادھر اُدھر پھڑپھڑاتے ہیں۔ مگر نقارے کی آواز میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ کوئی انکو چومتا ہے۔ کوئی پیار کرتا ہے۔ کوئی گلے لگاتا ہے۔ دوپہر تک یہی چھیڑ چھاڑ ہوا کی۔ اُنکی دل لگی ایسی بھدّی اور غلیظ ہوتی ہے کہ کئی بار میرا جی بدمزہ ہو گیا

دوپہر ہو گیا لیکن تلسا ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے کہا آج ہمارے یہاں تمہارا نیوتہ ہے۔ ہم تم ساتھ ساتھ کھائینگی۔ یہ سنتے ہی مہراجن دو تھالیوں میں کھانا تکلف سے پروسکر لائیں۔ تلسا اسوقت کھڑکی کی طرف مُنہ کئے کھڑی تھی۔ میں نے جو اُسکا ہاتھ پکڑکر اپنی طرف کھینچا۔ تو اُسے اپنی پیاری پیاری آنکھوں سے موتی کے دانے بکھیرتے ہوئے پایا۔ گلے لگاکر بولی سکھی سچ سچ بتلا دو کیوں رو رہی ہو۔ ہمسے کوئی پردہ مت رکھو۔ اِسپر وہ اور بھی سسکنے لگے۔ جب میں بہت پُر لعند ہوئی تو اُسنے سر نیچا کرکے کہا۔ "بہن آج سویرے اُنپر نشان پڑگیا۔ نہیں معلوم اُنپر کیا بیت رہی ہوگی"۔ یہ کہکر وہ زار و قطار رونے لگی۔ معلوم ہوا کہ رادھا کے باپ نے کچھ قرض لیا تھا۔ وہ ابھی تک ادا نہ ہوسکا تھا۔ مہاجن نے سمجھا اِسے حوالات لیچلوں تو روپیہ وصول ہو جائے۔ رادھا کنی کاٹتا پھرتا تھا۔ آج حریفوں کو موقع ملگیا۔ اور وہ اپنا کام کرگئے۔ افسوس! مواخذہ بیس روپیہ سے زائد نہ تھا۔ پہلے مجھے معلوم ہوتا تو غریب پر برس برس کے دن یہ مصیبت نہ آنے پاتی۔ میں نے چپکے سے مہراج کو بلایا۔ اور اُنھیں بیس روپئے دیکر رادھا کو رہا کرنے کے لئے روانہ کیا۔

اسوقت میرے دروازہ پر ایک ٹاٹ بچھا دیا گیا تھا۔ لالہ جی بیچ میں قالین پر بیٹھے تھے۔ کسان لوگ گھٹنے تک دھوتیاں باندھے۔ کوئی کرتہ پہنے۔ کوئی ننگے بدن۔ کوئی سر پر پگڑی باندھے۔ کوئی ننگے سر۔ مُنہ پر عبیر ملے (جو انکی کالی صورت پر خاص کیفیت پیدا کر رہی تھی) آنے لگے۔ جو آتا لالہ جی کے پیروں پر تھوڑی سی عبیر رکھدیتا۔ لالہ جی بھی اپنی طشتری میں سے فداسی عبیر نکالکر اسکے ماتھے پر لگا دیتے۔ اور مُسکراکر کوئی دلگی کی بات کہدیتے۔ وہ نہال ہو جاتا۔ زمین دوز ہوکر سلام کرتا۔ اور ایسا خوش خوش آکر بیٹھ جاتا۔ گویا

اُسے کوئی دولت ملی ہے۔ مجھے خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ لالہ جی اِن اُجڈ دیہاتیوں کے
ساتھ بیٹھکر ایسے مزے سے باتیں کر سکتے ہیں۔ اسی اثنا میں کاشی بھر آیا۔ اُسکے ہاتھ میں
ایک چھوٹی سی پیالی تھی۔ اُسمیں عبیر لئے ہوئے تھا۔ مگر اُسنے اوروں کی طرح عبیر لالہ جی کے
پیروں پہ نہیں رکھی۔ بلکہ بڑی دلیری سے مٹھی بھر لیکر انکے چہرے پر اچھی طرح ملدی۔ میں
تو ڈری کہیں لالہ جی بدمزہ نہو جائیں۔ مگر وہ بہت خوش ہوئے اور خود بھی بجائے ایک ٹیکہ
لگانے کے دونوں ہاتھوں سے اُسکے مُنہ میں عبیر ملی۔ بعد ازاں مسکرا کر کہا "آج اپنے
گھر میں کہدینا ہمارے لئے بچھاون تیار رہے۔" کاشی نے بھی اُسی طرح مسکرا کر کہا "سرکار
ہم برس برس کے دن کہاں جائیں گے؟" اسوقت کاشی کا چہرہ دیکھنے قابل تھا۔ وہ اپنی
نگاہ میں اپنے تمام ساتھیوں کا راجہ معلوم ہوتا تھا۔ اُسکے ساتھی بھی اُسکی طرف ایسی
نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ بیشک تو شیر ہے۔ اور تو اس قابل ہے کہ ہمارا سردار بنے۔
اسی طرح ایک ایک کرکے دو ڈھائی سو آدمی جمع ہوگئے۔ یکایک انھوں نے کہا آج کہیں
رادھا نہیں نظر آتا۔ کیا بات ہے۔ کوئی اُسکے گھر جاکے دیکھے تو منشی جگدمبا پرشاد اظہار لیاقت
کا اچھا موقع دیکھکر بول اُٹھے "حضور وہ تو بہ علت قرضہ زیر دفعہ ۱۳ نمبر الف ایکٹ (ج)
گرفتار ہوگیا۔ رامدین پانڈے نے وارنٹ کا خرچہ داخل کر دیا تھا۔ حسن اتفاق سے
رامدین پانڈے بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ لالہ نے اُنکی طرف نہایت حقارت آمیز
نگاہوں سے دیکھکر کہا کیوں پانڈے جی اس غریب کو حوالات میں بند کرانے سے تمہارا
گھر بھر جائیگا۔ یہی انسانیت اور شرافت اب رہ گئی ہے۔ تمھیں ذرا بھی رحم نہ آیا کہ ہولی کے
دن اُسے بیوی بچوں سے الگ کر دیا۔ میں تو بہ ایمان کہتا ہوں کہ اگر میں رادھا ہوتا تو جیلخانہ
سے واپس آنے کے بعد میری پہلی کوشش ہوتی کہ جسنے مجھے یہہ دن دکھایا ہے اُسے میں بھی

کچھ دنوں ہلدی بلوادوں۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ اتنے معتبر مہاجن ہوکر تمنے بیس روپئے کے لئے ایک غریب آدمی کو یوں مصیبت میں ڈالا۔ ڈوب مرنا چاہئے ایسی لالچ پر" لالہ جی کو واقعی غصہ آگیا تھا۔ رام دین ایسا خفیف ہوا کہ سب سٹی پٹی بھول گئی۔ منہ سے بات نہ نکلی۔ چپکے سے کچہری کی طرف چلے۔ سب کے سب کسان اُسکی طرف غضبناک نگاہوں سے تاک رہے تھے۔ اگر لالہ جی کا خوف نہوتا تو پانڈے جی کی ہڈی پسلی وہیں چور ہو جاتی۔

اسکے بعد لالہ جی گھر میں آئے۔ اور اپنے کمرہ میں بیٹھکر بنت عنب سے کچھ شوق کرنے لگے۔ باہر حاضرین محفل نے گانا شروع کیا۔ نشہ میں تو سب کے سب چور ہو رہے تھے۔ اسپر لالہ جی کے ان برادرانہ خاطر و مدارات نے اُنکے دلوں کو اور بھی اُبھار دیا تھا۔ خوب ہی جی توڑ کر گایا۔ دفلی تو ایسی زور سے بجتی تھی کہ اب پھٹی اور اب پھٹی۔ جگدمبا پرشاد نے دوہرا نشہ جمایا تھا۔ کچھ تو اُنکے دل میں خود بخود اُمنگ پیدا ہوا۔ کچھ دوسروں نے اشتعال دیا۔ آپ بیچ محلس میں کھڑے ہوکر ناچنے لگے۔ یقین مانو ناچنے لگے۔ مینے اچکن۔ ٹوپی۔ دھوتی اور موچھوں والے آدمی کو ناچتے نہ دیکھا تھا۔ آدھ گھنٹے تک وہ بندروں کی طرح اُچھلتے کودتے رہے۔ آخر نشہ نے انھیں زمین پر سولا دیا۔ اُنکے بعد ایک اور اہیر اُٹھا۔ ایک اہیرن بھی زنانہ جماعت سے نکلی۔ اور دونوں میدان میں جاکر ناچنے لگے۔ دونوں نوجوان تھے۔ اور پُھرتیلے۔ اُنکی کمر اور پشت کی لچک واقعی حیرت انگیز تھی۔ دف تال دے رہا تھا۔ اُنکے رمز و کنائے۔ عشوے و غمزے۔ کمر کا لچکنا اور بوٹی بوٹی کا پھڑکنا۔ گردن کا موڑ اور عصا کا مروڑ دیکھکر حیرت ہوتی تھی۔ بہت مشق اور محنت کا کام ہے۔ مگر اکثر ادائیں اور کنائے بیحیائی اور بے شرمی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ تلسا بھی ناچتی ہے۔ مگر رادھا کے سوا اور کسی کے ساتھ نہیں۔ اور یہی چاہئے بھی۔

ابھی یہاں ناچ ہی ہو رہا تھا کہ سامنے بہت سے آدمی لمبی لمبی لاٹھیاں کندھوں پر رکھے آتے دکھائی دئے اُنکے ساتھ ایک دف بھی تھا۔ اور کئی آدمی ہاتھوں میں جھانجھ اور مجیرے لئے ہوئے تھے۔ وہ گاتے بجاتے آئے۔ اور ہمارے دروازے پر رُکے۔ یکایک تین چار آدمیوں نے ملکر ایسی زور سے آر۔ ر۔ ر۔ ر۔ ر۔ کبیر کا نعرہ لگایا کہ مکان ہل اُٹھا۔ لالہ جی نکلے۔ یہہ لوگ اُسی موضع کے تھے جہاں نکاسی کے دن لاٹھیاں چلی تھیں لالہ جی کو دیکھتے ہی کئی آدمیوں نے اُنکے مُنہ پر عبیر ملی۔ لالہ جی نے بھی جوابدیا۔ پھر لوگ فرش پر بیٹھے الائچی اور پان سے خاطر کیگئی۔ پھر گانا ہوا۔ اس گانوں والوں نے بھی عبیریں ملیں اور ملوائیں۔ جب یہہ لوگ رخصت ہونے لگے تو یہہ ہولی گائی۔

سدا انند رہے اس دوارے ✣ موہن کھیلیں ہوری

کتنا خوبصورت گیت ہے مجھے تو اس میں جذبہ اور اثر کوٹ کوٹ کر بھرا معلوم ہوتا ہے۔ ہولی کی غرض اور غایت کیسے سادے اور مختصر الفاظ میں بیان کر دیگئی ہے۔ سدا انند رہے اس دوارے موہن کھیلیں ہوری۔ میں بار بار یہہ پیارا گیت گاتی ہوں اور مزہ لیتی ہوں۔ ہولی کا تہوار آپسمیں اخلاص و پیار۔ محبت و اتحاد بڑھانے کے لئے ہے۔ ممکن نہ تھا کہ وہی لوگ جن سے چند روز قبل ماتھا پھٹول کی نوبت آچکی تھی اس گانوں میں یوں بے محابا چلے آتے۔ مگر یہہ ہولی کا دن ہے۔ آج کسی کو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ آج امن کی بادشاہت ہے۔ آج محبت اور مسرت کا راج ہے۔ آج خوشی کا دور ہے۔ آج کے دن اگر رنج کرے تو پردیسی بالم کی اَبلا۔ روئے تو نوجوان بیوہ۔ اِن کے سوا اور سب کے لئے خوشی کا صلائے عام ہے کہ خوب مزے کرو۔ اور خوب گلچھرے اُڑاؤ۔

آنے جانیوالوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ یکایک لالہ جی کی تین آواز آر۔ ر۔ کبیر

کہتی ہوئی سُنائی دی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو واقعی وہی
گالوں پر ہاتھ دھرے۔ اَر۔ ر۔ ر۔ ر۔ کی ہانک لگا رہے ہیں۔ کبیر یہہ ہے۔

ہولی کے دن آئے پیارے کہ گھر گھر ڈھنڈھورا دیو پھرائے۔
جو نر اب مدرا نہ پئے واکو ساتوں جنم لنسائے۔

خوب! لالہ جی کی زبان سے اور یہہ ہولی! شام کیوقت گالوں کی سب عورتیں ہمارے
یہاں ہولی کھیلنے آئیں ہر ایک اپنے اپنے لوٹے میں گھولی ہوئی عبیر لئے ہوئے تھے۔ اماں نے
انھیں بڑی عزت سے بٹھایا۔ رنگ کھیلا۔ پان تقسیم کیا۔ میں مارے خوف کے باہر نہ نکلی۔
اسطرح نجات ملی۔ اب مجھے خیال آیا کہ مادھوی دو پہر سے غائب ہے۔ میں نے
سوچا تھا شائد گالوں میں ہولی کھیلنے گئی ہو۔ مگر اِن عورتوں کے ساتھ وہ نہ تھی۔ تُلسا
ابھی تک چپ چاپ من مارے کھڑکی کی طرف مُنہ کئے بیٹھی تھی۔ چراغ میں بتی پڑ رہی
تھی کہ وہ یکایک اُٹھی اور میرے پیروں پر گر کر رونے لگی۔ میں نے کھڑکی کی طرف جھانکا
تو دیکھتی ہوں کہ آگے آگے مہاراج۔ اُنکے پیچھے رادھا۔ اور سب سے پیچھے رامدین پانڈے
چلے آرہے ہیں۔ گالوں کے بہت سے آدمی اُنکے ساتھ ہیں۔ رادھا کا چہرہ مُرجھایا ہوا ہے
لالہ جی نے جوں ہی سُنا کہ رادھا آگیا چٹ باہر نکل آئے۔ اور بڑی محبت سے اُسے
گلے لگالیا۔ جیسے کوئی اپنے بیٹے کو گلے لگاتا ہے۔ رادھا چیخیں مار مار رونے لگا۔
تلسا سے بھی ضبط نہو سکا وہ زینہ سے اُتری۔ اور لالہ جی کے پیروں پر گر پڑی۔ لالہ جی نے
اُسے بھی بڑی محبت سے اُٹھایا۔ میری آنکھوں سے بھی اُسوقت ضبط نہو سکا۔ گالوں
کے بہت سے آدمی رو رہے تھے۔ نہایت دردناک سین تھا۔ لاجی کی آنکھوں میں میں نے
کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے۔ وہ اسوقت دیکھے۔ رامدین پانڈے سر نیچا کئے ایسا کھڑا تھا

جیسے گئو ہتیا کی ہو۔ میرے روپئے مل گئے۔ مگر نیت ہے اسے تلسا کے لئے ایک گائے لینے میں خرچ کروں۔

رادھا اور تُلسا دونوں اپنے گھر گئے۔ مگر ذرا دیر میں تُلسا مادھوی کا ہاتھ پکڑے ہنستی ہوئی میرے کمرہ میں آئی اور بولی "اِن سے پوچھو یہ اب تک کہاں تھیں"

میں۔ "کہاں تھیں تم؟۔ دوپہر سے غائب ہو"

مادھوی۔ "یہیں تو تھی"

میں۔ "یہاں کہاں تھیں۔ میں نے دوپہر سے نہیں دیکھا۔ سچ سچ بتا دو۔ میں ناراض ہونگی"

مادھوی۔ "تُلسا کے گھر تو چلی گئی تھی"

میں۔ "تُلسا تو یہاں بیٹھی ہے۔ وہاں اکیلے کیا سوتی رہیں؟"

تُلسا۔ (ہنس کر) "سوتی کاہے کو رہیں۔ جاگتی رہیں۔ کھانا پکاتی رہیں۔ چوکا برتن کرتی رہیں۔

مادھوی۔ "ہاں چوکا برتن کرتی رہی۔ کوئی تمہارا نوکر لگا ہوا ہے نہ"

معلوم ہوا کہ جب سے میں نے مہاراج کو رادھا کو چھڑانے کے لئے روانہ کیا تھا تب سے مادھوی تُلسا کے گھر کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ اُسکے کواڑ کھولے۔ یہاں سے آٹا۔ گھی۔ شکر سب لیگئی۔ آگ جلائی۔ اور پوریاں کچوریاں۔ گلگلے میٹھے سموسے سب بڑی نفاست سے بنائے۔ اُسنے سوچا تھا کہ میں یہ سب بنا کر چپکے سے چلی جاؤنگی۔ جب رادھا اور تُلسا آئیں گی تو تعجب کرینگی۔ کہ کون بنا گیا۔ مگر غالباً دیر زیادہ ہوگئی۔ اور مجرم پکڑ لیا گیا۔ دیکھو کیسی نیک بخت لڑکی ہے۔

اتنی سمع خراشی کے بعد رخصت ہوتی ہوں۔ شکایتیں معاف کرنا۔ تمہاری چیری ہوں جیسے رکھوگے ویسے رہونگی۔ عبیر اور گلال بھیجتی ہوں۔ یہ تمہاری کنیز کا تحفہ ہے۔

تمھیں ہماری قسم جھوٹی تہذیب کے جوش میں آ کر اسے پھینک نہ دینا۔ ورنہ میرا دل دکھیگا۔

تمھاری برجن

(۵)

مجگانوں۔

پیارے! تمھارے خط نے بہت رولایا۔ اب نہیں رہا جاتا۔ مجھے بلا لو۔ ایک نظر دیکھکر چلی آؤنگی۔ سچ بتاؤ اگر میں تمھارے یہاں آجاؤں تو مسخرے پن کی تو نہ لوگے۔ نہیں معلوم دل میں کیا سمجھو گے۔ مگر کیسے آؤں۔ تم لالہ جی کو لکھو۔ خوب! وہ کہیں گے یہہ نئی دھن سمائی ہے۔

کل چارپائی پر پڑی تھی۔ سویرا ہو گیا تھا۔ خوب ٹھنڈی ٹھنڈی۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی کہ عورتوں کی گانے کی آواز کان میں آئی۔ عورتیں اناج کاٹنے جا رہی تھیں۔ جھانک کر دیکھا تو دس دس بارہ بارہ عورتوں کی ایک ایک جماعت تھی۔ سبھوں کے ہاتھوں میں ھنسیا کندھے پر گٹھیا باندھنے کی رسی اور سر پر بھنے ہوئے مٹر کی چھبری تھی۔ یہہ اسوقت جاتی ہیں کہیں بارہ بجے لوٹیں گی۔ آپسمیں گاتے۔ چہلیں کرتے چلی جاتی تھیں۔ اور گیت بھی کیسا سہاتا تھا۔

موراسئیاں گھرے آئے۔ رتیاں

چُن چُن کلیاں میں سیج بچھایوں + سیج نہ سوئے دھرے موری بہیاں

مورے سئیاں گھرے آئے رتیاں

صبح کا وقت مستانہ آوازیں۔ مسرت سے بھرے ہوئے دل۔ یہہ گیت بہت

مزے دار معلوم ہوتا تھا۔ اُنکے ستیاں گھر آئے۔ کیا میرے گھر بھی کبھی ستیاں آئیں گے۔

دوپہر تک بڑی خیریت سے گذری۔ یکایک آسمان پر بادل چھا گیا۔ آندھی آ گئی۔ اور اولے گرنے لگے۔ میں نے اتنے بڑے اولے گرتے نہ دیکھے تھے۔ آلو سے بڑے۔ اور ایسی تیزی سے گرے۔ جیسے بندوق کی گولی۔ دم کی دم میں زمین پر ایک فٹ اونچا اولے کا سفید فرش بچھ گیا۔ چو طرفہ سے کسان بھاگنے لگے۔ گائیں۔ بیل بکریاں سب چلاتی ہوئی پیڑوں کا سایہ ڈھونڈھتی پھرتی تھی میں ڈری کہ نہیں معلوم تُلسا پر کیا بیتی۔ نظر دوڑا کر دیکھا تو ایک کھلے میدان میں جو اناج کے کٹ جانے سے کفِ دست ہو رہا تھا تُلسا۔ رادھا اور موہن گائے نظر آئیں۔ تینوں گھمسان اولے کی زد میں پڑے ہوئے تھے۔ تُلسا کے سر پر ایک چھوٹی سی ٹوکری تھی۔ اور رادھا کے سر پر ایک بڑا سا گٹھا۔ میرے آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہ نہیں معلوم اِن بیچاروں کا کیا حشر ہوگا۔ دفعتاً ایک سخت جھونکے نے رادھا کے سر سے گٹھا گرا دیا۔ گٹھا کا گرنا تھا کہ دم زدن میں تُلسا نے اپنی ٹوکری اُسکے سر پر اوندھا دی۔ نہیں معلوم اُس پھول سے جسم پر کتنے اولے پڑے۔ اُسکے ہاتھ کبھی پیٹھ پر جاتے۔ کبھی سر سہلاتے۔ ایک سکنڈ سے زیادہ یہ حالت نہ رہی ہوگی کہ رادھا نے بجلی کی طرح جھپٹ کر گٹھا اُٹھا لیا۔ اور ٹوکری تُلسا کو دیدی۔ کیسی زبردست محبت ہے!

ظالم آسمان نے سارے سامان بگاڑ دیئے۔ سویرے عورتیں گاتے ہوئے جا رہی تھیں۔ شام کو گھر گھر ماتم بپا تھا۔ کتنوں کے سر لہولہان ہو گئے۔ کتنے ہلدی پی رہے ہیں۔ فصل ستیاناس ہو گئی۔ اناج برف کے تلے دب گیا۔ بخار کا زور ہے۔ سارا گانوں اسپتال بنا ہوا ہے۔ کاشی بھر کی پیشین گوئی صادق آئی۔ ہولی کے شعلوں کا راز ظاہر ہو گیا۔

فصل کا یہ حال۔ اور مالگذاری وصول کی جارہی ہے۔ بڑی بدعت ہورہی ہے۔ مار دھاڑ گالی گفتہ غرض سبھی ہتھیاروں سے کام لیا جارہا ہے۔ غریبوں پر یہ قہر خدا۔

تمہاری برجن

(۶)

مجگانوں۔

میرے جان سے پیارے بالم۔ پورے پندرہ دن کے بعد تمنے برجن کو یاد کیا۔ خط کو بار بار پڑھا۔ چوما۔ آنکھوں سے لگایا۔ اور ایک ایک حرف کا مزہ لیا تمہارا خط بلا مُرلائے نہیں مانتا۔ میں یوں بھی بہت رویا کرتی ہوں۔ تمکو کن کن باتوں کی یاد دلاؤں۔ میرا دل ایسا کمزور ہے کہ جب کبھی ان باتوں کی طرف خیال جاتا ہے تو عجب بیچینی سے ہوجاتی ہے۔ گرمی سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک بڑا بے چین کرنیوالا۔ بڑا بامزہ۔ بہت رُلانیوالا۔ بہت پُر حسرت درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ جانتی ہوں کہ تم نہیں آرہے ہو۔ اور نہ آؤگے۔ مگر بار بار دروازہ پر جاکر کھڑی ہوجاتی ہوں کہ تم آلو نہیں گئے۔ آجکل تمہارے لئے ایک ریشمی بوٹے دار قمیص تیار کررہی ہوں۔ جی چاہتا ہے تم یہاں آستے۔ میں کہتی ذرا ٹھیرو۔ دیکھو ٹھیک کٹی ہے یا نہیں۔ تب سلائی طے کرنے لگتی۔ تم کچھ اور دیتے۔ میں کچھ اور مانگتی۔ مگر لو۔ ایسی باتیں نہ کرونگی۔ تمہارا ہرج ہوگا۔

کل شام کو یہاں ایک بڑا دلفریب تماشہ دیکھنے میں آیا۔ یہ دھوبیوں کا ناچ تھا۔ پندرہ بیس آدمیوں کی ایک جماعت تھی۔ اُنمیں ایک نوجوان شخص۔ سفید پشواز پہنے۔ کمر میں بے شمار گھنٹیاں باندھے۔ پیر میں گھونگھرو پہنے۔ سر پر ایک لال ٹوپی رکھے ناچ رہا ہے۔ جب

جب یہ شخص ناچتا ہے تو مردنگ بجنے لگتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہولی کا انعام مانگنے
آئے ہیں۔ یہ ذات بھی عجیب انعام لینے والی ذات ہے۔ آپ کے یہاں کوئی کام کاج
پڑے تو انھیں انعام دیجیے۔ اور انکے یہاں کوئی کام کاج ہو تو بھی انعام دئے جائیے۔
یہ لوگ ناچتے وقت گیت نہیں گاتے۔ انکا گانا انکی شاعری ہے۔ پشواز والا شخص ڈھول
پر ہاتھ رکھکر ایک برہا کہتا ہے۔ دوسرا آدمی سامنے سے آکر اس برہے کا جواب دیتا ہے۔
اور دونوں فی البدیہہ کہتے ہیں۔ اس ذات میں شاعرانہ قابلیت بہت زیادہ ہے۔ ان برہوں کو غور سے
سنو تو انمیں بعض نہایت باریک شاعرانہ خیالات ادا کیے جاتے ہیں۔ پشواز والے شخص نے پہلا برہا
جو کہا تھا اسکے یہ معنی تھے کہ اے دھوبی کے بچو۔ تم کسکے دروازہ پر آکر کھڑے ہو۔ دوسرے نے
جواب دیا تھا اب نہ اکبر شاہ ہے۔ نہ راجہ بھوج۔ اب جو ہیں ہمارے مالک ہیں۔ انھیں سے مانگو۔ تیسرے
برہے کا مطلب تھا کہ منگنوں کی عزت کم ہو جاتی ہے۔ اسلئے تم لوگ کچھ سوال مت کرو۔ گا بجا کر چلے چلو۔
دینے والا بن مانگے ہی دیگا۔ گھنٹہ بھر تک یہ لوگ برہے کہتے رہے۔ تمھیں یقین نہ آئیگا۔ انکے منہ سے
برہے اسطرح بے تکلف نکلتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ شاید اتنی آسانی سے وہ بات چیت بھی
نہ کر سکیں۔ یہ ذات بڑی بلانوش ہے۔ انتہا درجہ کی پیکڑ۔ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں۔ بیاہ
میں شراب۔ گونے میں شراب۔ پنچایت میں شراب۔ پوجا پاٹ میں شراب۔ انعام مانگیں گے تو
پینے کے لئے۔ دھلائی مانگیں گے تو یہ کہکر کہ آج پینے کو پیسہ نہیں ہے۔ رخصت ہوتے وقت
بیچو دھوبی نے جو دعائیہ برہا کہا تھا وہ شاعرانہ استعارات سے بھرا ہوا ہے۔

تمہارا پروار اسطرح بڑھے جیسے گنگا کا پانی۔ لڑکے پھلیں پھولیں جیسے آم کی بور۔ مالکن کا
سہاگ سدا بنا رہے۔ جیسے دوب کی ہریالی۔ کیسی نادر شاعری ہے۔ زیادہ بجز اشتیاق دیدار کے اور کیا لکھوں۔

تمہاری برجن

(۷)

مجگالوں۔

پیارے۔ ایک ہفتہ تک خاموش رہنے کی معافی چاہتی ہوں۔ خوب! آپکو شکوہ شکایت
کا کیسا نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ واہ رے ہٹ دھرمی۔ مجھپر یہ الزام کہ ہفتوں سُدھ نہیں لیتی ہو
بجا فرماتے ہو۔ میرے خطوط گن کر دیکھو تو۔ ابھی کچھ نہیں تو نصف درجن چٹھیوں کے دیندار
ہوگے۔ مجھے اس ہفتہ میں بالکل فرصت نہیں ملی۔ مادھوی بیمار ہوگئی تھی پہلے تو کونین کی
چند پڑیاں کھلائی گئیں۔ مگر جب اس سے افاقہ نہوا۔ اور اُسکی حالت بہت خراب ہوگئی
تو دہلورا سے بید بُلائے گئے۔ کوئی پچاس کا سن ہوگا۔ برہنہ پا۔ سر پر ایک پگڑی باندھے۔
کندھے پر انگوچھا رکھے۔ ہاتھ میں موٹا سا سوٹا لئے دروازہ پر آکر بیٹھ گئے۔ گھر کے بڑے
زمیندار ہیں۔ مگر انکے بدن پر کسی نے سیدھی مرزائی نہیں دیکھی۔ اُنھیں اتنی فرصت
ہی نہیں کہ اپنی تن پروری کی طرف متوجہ ہوں۔ اس نواح میں آٹھ دس کوس تک لوگ انکے
معتقد ہیں۔ نہ وہ حکیم کو جانیں۔ نہ ڈاکٹر کو۔ اُنکا حکیم۔ ڈاکٹر جو کچھ ہیں وہ دہلورا سے ہیں۔
پیغام سنتے ہی آکر دروازہ پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹروں کی طرح نہیں کہ پہلے سواری مانگیں گے۔ وہ بھی
چاق چست۔ تاکہ اُنکا وقت ضائع نہو۔ آپکے گھر آکر ایسے خاموش بیٹھے رہیں گے گویا گونگے
کا گڑ کھا گئے ہیں۔ مریض کو دیکھنے جائیں گے تو اس طرح بھاگیں گے گویا کمرہ کی ہوا میں زہر بھری
ہوئی ہے۔ تشخیص مرض۔ تجویز دوا سب کچھ دو منٹ میں ختم! دہلورا سے ڈاکٹر نہ سہی۔ مگر جتنے
آدمیونکو انکی ذات سے فیض پہونچا ہے۔ اُنکی تعداد کا اندازہ کرنا محال ہے۔ ہمدردی اُنکا
اصول ہے۔ اُنکی صورت دیکھتے ہی مریض کا آدھا روگ دور ہو جاتا ہے۔ اُنکے نسخے ایسے سہل
اور عام کہ بلا دام کوڑی خرچ کئے منٹوں بٹور لائے۔ تین ہی دن میں مادھوی چلنے پھرنے لگی۔

واقعی اس شخص کی دعا میں اعجاز ہے!

یہاں اندنوں مغلئے اُدھم مچائے ہوئے ہیں۔ یہہ لوگ جاڑے میں کپڑا دیجاتے ہیں۔اور جیت میں دام وصول کرلیتے ہیں۔اُسوقت کوئی عذر نہیں سُنتے۔گالی گلوچ۔مارپیٹ سبھی باتوں پر اُتر آتے ہیں۔ دو تین آدمیونکو بہت مارا۔ رادھا نے بھی کچھ کپڑے لئے تھے۔ اُسکے دروازے پر جاکر سب کے سب گالیاں بکنے لگے۔ تلسا نے اندر سے کواڑ بند کرلئے۔ جب یوں بس نہ چلا تو ایک نے موہنی گائے کھونٹے سے کھول لی۔ اور کشاں کشاں چلا۔ اِتنے میں رادھا دور سے آتا دکھائی دیا۔ آتے ہی آتے اُسنے لاٹھی کا وہ بھرپور ہاتھ دیا کہ مغلئے کی کلائی لٹک پڑی۔ تب تو مغلئے گرم ہوئے۔ پینترے بدلنے لگے۔ رادھا بھی جان پہ کھیل گیا۔ اور تین بدمعاشوں کو بیکام کر دیا۔ اتنے میں کاشی بھر نے آکر ایک مغلئے کی خبر لی۔ دہلوا سے کو مغلیوں سے چڑھ ہے۔ وہ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ میں نے انکا اتنا روپیہ ڈبا دیا۔ اتنوں کو پٹوا دیا۔ یہہ شور و غل سنتے ہی بہت سے نکلے اور للکارا صدہا آدمی لاٹھیاں لے لے کر دوڑ پڑے۔ اور مغلیوں کی خوب مرمت ہوئی۔ یقین ہے کہ اب ادھر آنے کی جرأت نہ کریں گے۔

اب تو مئی کا مہینہ گذرا۔ کیا ابھی فرصت نہیں ہوئی۔ رات دن تمہارے آنیکا انتظار ہے۔ شہر میں بیماری کم ہوگئی۔ اور ہم لوگ بہت جلد یہاں سے چلے جائینگے۔ افسوس تم اس پیارے گانوں کی سیر نہ کر سکو گے۔

تمہاری برجن

(۸)

پیارے۔ تمہاری خموشی مارے ڈالتی ہے۔ کل ہم لوگ شہر آگئے۔ اب تم بھی آؤ۔

وہاں پڑے پڑے کیا کرتے ہو۔ دو تین خط لکھ چکی۔ مگر نہ آتے ہو۔ نہ جواب دیتے ہو۔ رات دن
آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ رات کو آنکھیں نہیں جھپکتیں۔ کتا بھونکا اور میرا دل دھڑکنے لگا۔
کبھی کی آواز آئی اور میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ شاید مجھ سے ناراض ہو۔ خیر یہاں کسی طرح آ تو جاؤ۔
تمہاری ناراضگی کا علاج تو میرے پاس ہے۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ چراغ کے سامنے
نہیں بیٹھا جاتا۔ ایشور کرے سویرے تمہارا درشن ہو۔ اور یہ خط گھومتا ہوا یہیں آوے۔

تمہاری برجن

(۹)

پیارے! لالہ جی کو خط لکھا۔ اور مجھے نہیں۔ میں نے ایسا کیا قصور کیا تھا۔ خیر کیا شکر ہے
تم خیریت سے تو ہو۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ اب آنے کے لئے نہ لکھونگی۔ جو کچھ دل پر
بیتیگی سہ لونگی۔ کسکے آگے روئے۔ اپنا دیدہ کھوئے۔ لو رخصت! بہتر ہے مراد آباد جاؤ۔ یہاں
تمہارا کون ہے۔

تمہاری برجن
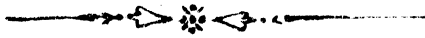
انیسویں فصل

بالکرام اور کملاچرن

پرتاپ چندر کو الٰہ آباد کالج میں پڑھتے تین سال ہو چکے تھے۔ اور اس مدت میں اُسنے اپنے ہمچشموں اور اتالیقوں کی نگاہوں میں بہت ممتاز درجہ حاصل کر لیا تھا کالج کی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جہاں اُسکے کمالات نے قدردانی کا سہرا نہ پہنا ہو۔ پروفیسر اُسپر فخر کرتے۔ اور طلبا اُسے اپنا رہنما سمجھتے۔ جسطرح کھیل کے میدان میں اُسکا دست اعجاز نمایاں تھا۔ اسیطرح لکچر روم میں اُسکی قابلیت اور نکتہ رسی مسلم تھی۔ کالج کے متعلق ایک عام انجمن احباب قائم کی گئی تھی۔ شہر کے علم دوست رؤسا۔ کالج کے پروفیسر اور طلبا سب اُسکے ممبر تھے۔ پرتاپ اس انجمن کا ماہ درخشاں تھا۔ یہاں ملکی و تمدنی مسائل پر مباحثے ہوا کرتے تھے۔ اور پرتاپ کی تقریریں ایسی پُرزور اور مُدلل ہوتیں کہ پروفیسروں کو بھی اُسکی وسعت تحقیقات اور تلاش پر حیرت ہوتی۔ اُسکی تقریر اور تحریر دونوں ہی میں جادو تھا۔ جسوقت وہ اپنا سادہ لباس پہنے ہوئے پلیٹ فارم پر جاتا تو حاضرین کی آنکھیں اُسکی طرف اُٹھ جاتیں اور دلوں میں گدگدی ہونے لگتی۔ اُسکا انداز تقریر۔ اُسکے اشارے۔ اُسکا لب و لہجہ۔ اُسکے عصا کی حرکت سبھی ایسے موثر تھے کہ اُسکی تقریر میں گویا قدرت نے اثر بھر دیا ہے۔ جب تک وہ پلیٹ فارم پر رہتا حاضرین پر ایک تسخیر کا عالم ہوتا۔ مرحبا کے نعرے بار بار بلند ہوتے۔ اسکا ایک ایک فقرہ دلوں میں چُبھ جاتا۔ اور زبان سے بے اختیار واہ واہ کا شور بلند ہو جاتا۔ اسی خیال سے اُسکی تقریریں عموماً اختتام کے وقت ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ زیادہ تر شائقین صرف اسی کی گرم زبانیوں کا لطف اُٹھانے کے لئے

آیا کرتے تھے۔ اُسکے الفاظ اور انداز میں خداداد اثر تھا جو قوت کسب سے بہت بلند ہے۔ ادب اور تاریخ اُسکے تعمقات اور مطالعہ کے خاص صیغے تھے۔ قوموں کے عروج و زوال۔ اور اُسکے اسباب و حالات پر وہ اکثر تقریریں کرتا۔ اسوقت اُسکے ان جگر کاویوں کے محرک زیادہ تر حاضرین کے نعرۂ تحسین ہوتے تھے۔ اور انہیں کو وہ اپنی محنت کا کافی بدل سمجھتا تھا۔ ہاں اُسکے مذاق کی یہہ روش دیکھکر یہہ البتہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہہ ہونہار پردا آگے چلکر کیسے پھل پھول لائیگا۔ اور کیسے رنگ روپ نکالیگا۔ ابھی تک اُسنے ایک لمحہ بھر بھی غور نہیں کیا تھا کہ میری آیندہ زندگی کی کیا صورت ہوگی۔ کبھی سوچتا پروفیسر بن جاؤنگا۔ اور خوب کتابیں لکھونگا۔ کبھی وکالت کی طرف خیال دوڑاتا۔ کبھی سوچتا کاش وظیفہ ملجاے تو سول سروس کی تیاری کردوں۔ کسی ایک طرف خیال نہ جمتا تھا۔

مگر پرتاپ چندر اُن طلبا میں نہ تھا جنکی تمام کوششیں مباحثے اور کتابوں ہی تک محدود رہتی ہیں۔ اُسکے وقت اور لیاقت کا ایک قلیل حصہ رفاہ عام کے کاموں میں بھی صرف ہوتا تھا۔ اُسنے خلقتہً ایک ہمدرد اور غریب پرور دل پایا تھا۔ اور عوام میں ملنے جلنے اور کام کرنے کی لیاقت اسے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ انھیں مشاغل میں اُسکی توجہ اور سرگرمی پورے جوش کے ساتھ ظاہر ہوتی تھی۔ اکثر شام کے وقت وہ کیٹ گنج اور کٹرہ کے متعفن گلیوں کی خاک چھانتا دکھائی دیتا۔ جہاں زیادہ تر نیچی ذاتیں آباد ہیں۔ اُسکی صورت ان حصوں میں بہت مانوس تھی۔ جن لوگوں کے سایہ سے اونچی ذات کا ہندو دور بھاگتا ہے اُنکے ساتھ پرتاپ لوٹی کھاٹ پر بیٹھکر گھنٹوں باتیں کرتا۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان محلوں کے بسنے والے اُسپر فدا ہونیکو تیار تھے۔ نخوت اور عیش پرستی۔ یہہ دو عیوب پرتاپ چندر میں نام کو بھی نہ تھے۔ کوئی بیکس آدمی ہو۔ پرتاپ اُسکی دستگیری کے لئے تیار تھا۔ کوئی بیکس

مریض ہو۔ پرتاپ اسکا سچا غمخوار اور تیمار دار تھا۔ کتنی راتیں اُسنے جھونپڑوں میں۔ کراہتے ہوئے مریضوں کے سرھانے کھڑے رہ کر کاٹی تھیں۔ اسی غرض سے اُسنے رفاہ عام کی ایک سبھا قائم کر رکھی تھی۔ اور ڈھائی سال کے مختصر زمانے میں اس انجمن نے جتنے کارگذاری سے پبلک کی خدمت کی اُسنے الہ آبادیوں کی ہمدردی اس طرف متوجہ کر دی تھی۔ پرتاپ اس انجمن کا روح رواں تھا۔ پچھلے دو سالوں سے اُسنے طاعون کے دنوں میں بھی۔ جبکہ لوگ اپنے پیاروں کو چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ جان ہتھیلی پر رکھکر طاعون زدہ خطوں میں علاج معالجہ کرنا شروع کیا تھا۔

کملاچرن جسوقت الہ آباد پہونچا پرتاپ چند رنے اُسکی بڑی آؤ بھگت کی۔ مرور ایام نے اُسکے دل سے حسد کی آگ بجھا دی تھی۔ جسوقت وہ برجن کی بیماری کی خبر پاکر بنارس پہونچا تھا۔ اور اُس سے ملاقات ہوتے ہی برجن کی حالت سنبھل چلی تھی اسیوقت سے پرتاپ کو یقین ہو گیا تھا کہ کملاچرن نے اُسکے دل میں وہ جگہ نہیں پائی جو میرے لئے مخصوص تھی۔ یہہ خیال حسد کا شعلہ فرو کرنے کے لئے کافی تھا۔ علاوہ اسکے اُسے اکثر یہہ خیال بھی بےچین کیا کرتا تھا کہ میں ہی سوسیلا کا قاتل ہوں۔ میری ہی بدزبانیاں اُس غریب کے جان کا گاہک ہوئیں۔ اور اُسیوقت سے جبکہ سوسیلا نے مرتے وقت اُس سے رو رو کر اپنے خطاؤں کی معافی مانگی تھی۔ پرتاپ نے دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ موقع ملا تو میں اس گناہ کی تلافی ضرور کرونگا۔ کملاچرن کی خاطر و مدارات اور تعلیم و تربیت میں اُسے کسی حدتک پرائشچت کے پورے کرنیکا نادر موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ علم و شعور میں وہ کملاچرن سے منزلوں آگے تھا۔ مگر اُس سے یوں پیش آتا جیسے چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے ساتھ اپنے وقت کا کچھ حصہ اسکی مدد کرنے میں صرف کرتا۔ اور ایسی سہولیت سے اتالیق کا فرض

ادا کرتا کہ تعلیم ایک دلچسپ مباحثہ کی صورت اختیار کر لیتی۔

مگر پرتاپ چند کی ان کوششوں کے باوجود کملا چرن کی طبیعت یہاں بہت گھبراتی۔ سارے بورڈنگ ہاؤس میں اُسکے مذاق کا ایک آدمی بھی نہ تھا جس سے وہ اپنا دردِ دل کہتا۔ اور اپنے زخمِ جگر پر مرہم رکھواتا۔ وہ یار باش۔ بےفکر رنگین مزاج آدمی تھا جسنے آج کے سوا کل کا کبھی خیال نہیں کیا۔ پرتاپ سے باوجود بےتکلفی کے وہ دل کی بہت سی باتیں نہ کہہ سکتا تھا۔ جب اکیلے پن سے طبیعت بہت اُکتاتی تو برجن کو کوسنے لگتا۔ کہ میرے سر پر یہ سب مصیبتیں اسکی لائی ہوئی ہیں۔ اُسے مجھ سے اُنس نہیں۔ زبان اور قلم کی محبت بھی کوئی محبت ہے۔ وہ محبت ہی کیا جو موقع اور مصلحت کی آڑ ڈھونڈھنے لگے۔ میں چاہے اُسپر جان ہی کیوں نہ دیدوں۔ مگر اُسکی محبت زبان اور قلم کے دائرہ سے باہر نہ نکلیگی۔ ایسے بت کے روبرو جو پسیجنا جانتا ہی نہو سر ٹپکنے سے کیا حاصل۔ اِن خیالات نے یہانتک زور پکڑا کہ اُسنے برجن کو خط لکھنا چھوڑ دیا۔ وہ بیچاری اپنے خطوط میں کلیجہ نکال کر رکھدیتی۔ مگر کملا جواب تک ندیتا۔ اور دیتا بھی تو خشک اور دلشکن۔ اسوقت اُسے برجن کی ایک ایک بات۔ اُسکی ایک ایک حرکت اُسکی سرد مہری کا پتہ دیتے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ ہاں اگر یاد نہ آتی تھیں تو برجن کی خاطر داریاں۔ اور دلسوزیاں۔ وہ نشیلی آنکھیں جو اس سے جدا ہوتے وقت ڈبڈبا گئی تھیں۔ اور وہ نازک نازک ہاتھ جنھوں نے باہم ملکر اُس سے منتیں کی تھیں کہ خط برابر بھیجتے رہنا اُسے یاد آجاتے تو ممکن تھا کہ اُسے کچھ تسکین ہوتی۔ مگر ایسے موقعوں پر انسان کا حافظہ دھوکا دیدیا کرتا ہے۔

آخر کملا چرن نے اپنے تنہائی کا ایک مشغلہ سوچ ہی نکالا۔ جسوقت سے اُسنے ہوش سنبھالا اُسیوقت سے بازارِ حسن کی سیر شروع کی۔ حسن پرستی اسکا خمیر ہو گئی تھ

اور اس قسم کا کوئی نہ کوئی مشغلہ اُسکے لئے ایسا ہی ضروری تھا جیسے بدن کے لئے غذا۔
بورڈنگ ہاؤس سے ملا ہوا ایک سیٹھ کا باغیچہ تھا۔ اور اُسکے رکھ رکھاؤ کے لئے ایک
مالی نوکر تھا۔ اس مالی کے ایک دوشیزہ لڑکی۔ سرجودیئی تھی اگرچہ بہت حسین نہ تھی۔
مگر کملا حسن کا اتنا طلبگار نہ تھا جتنا کسی دلبستگی کے مشغلہ کا۔ کوئی عورت جسکے چہرہ پر
شباب کی جھلک ہو اُسکا دل بہلانے کے لئے موزوں تھی۔ کملا اس لڑکی پر ڈورے
ڈالنے۔ شام سویرے بلاناغہ چمن کی روشوں میں ٹہلتا نظر آتا۔ اور لڑکے تو میدان
میں ورزش کرتے۔ مگر کملا چرن باغیچہ میں آکر تاک جھانک میں مصروف رہتا۔ رفتہ رفتہ
اُسنے سرجودیئی سے شناسائی۔ ہمدردی اور پھر محبت پیدا کرلی۔ وہ اُس سے گجرے مول
لیتا۔ اور نقد محبت کے علاوہ جو گنے دام دیتا۔ مالی کو تہوار کے موقع پر سب سے زیادہ
تہواری کملا چرن ہی سے ملتی۔ یہانتک کہ سرجودیئی اُسکے دام الفت کی اسیر ہوگئی۔
اور دو ایکبار تاریکی کے پردہ میں باہم ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ سب طلبا سیر کو گئے ہوئے تھے۔ کملا اکیلا باغیچہ میں
ٹہلتا تھا۔ اور رہ رہ کر مالی کے جھونپڑے کی طرف جھانکتا تھا۔ یکایک جھونپڑے میں سے
سرجودیئی نے اُسے اشارہ سے بلایا۔ اور کملا بڑی تیزی سے اندر گھس گیا۔ آج سرجودیئی
نے ململ کی ساڑی پہنی تھی جو کملا بابو کا تحفہ تھا۔ سر میں خوشبودار تیل ڈالا تھا جو کملا بابو
بازار سے لائے تھے۔ اور ایک چھینٹ کا سلوکا پہنے ہوئے تھی جو انھیں بابو صاحب
نے بنوایا تھا۔ یہ سب کملا بابو کی خاطر تھی اپنی طرف سے سرجودیئی نے صرف آنکھوں
میں کاجل لگایا تھا۔ آج وہ اپنی نگاہ میں بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ ورنہ کملا
امیر اور حسین آدمی کیوں اُسپر جان دیتا۔ کملا کھٹولے پر بیٹھا ہوا سرجودیئی کی

اداؤں کو مستانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے اسوقت سرجو دیئی برج رانی سے کسی طرح کم حسین نہیں نظر آتی تھی۔ رنگت میں ذرا سا فرق تھا۔ مگر یہہ کوئی ایسا بڑا فرق نہیں۔ اُسکی نگاہ میں سرجو دیئی کی محبّت سچّی۔ اور زیادہ پُرجوش معلوم ہوتی۔ کیونکہ وہ جب کبھی بنارس جانیکا تذکرہ کرتا تو سرجو دیئی زار زار رونے لگتی اور کہتی کہ مجھے بھی لیتے چلنا۔ میں تمہارا ساتھہ نہ چھوڑونگی۔ کہاں یہہ محبّت کی گرمی۔ اور جذبات کا زور۔ اور کہاں برجن کی نیم دلانہ خاطرداریاں۔ اور بیرحمانہ مصلحت آمیزیاں۔

کملا ابھی اچھی طرح آنکھوں کو سینکنے بھی نہ پایا تھا کہ یکایک مالی نے دروازہ پر آکر کھٹکھٹایا۔ اب تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ چہرہ کا رنگ اُڑ گیا۔ سرجو دیئی سے گڑگڑا کر بولا میں کہاں جاؤں۔ سرجو دیئی کے آپ ہی ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ گھبراہٹ میں زبان سے کچھ بات نہ نکلی۔ اتنے میں مالی نے پھر زنجیر کھٹکھٹائی۔ بچاری سرجو دیئی بے بس تھی۔ اسنے ڈرتے ڈرتے کواڑ کھولدیا۔ کملا چرن ایک کونے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ جسطرح بھینٹ کا بکرا کٹار کے تلے تڑپتا ہے۔ اسی طرح کونے میں کھڑے ہوئے کملا کا دل اسوقت تڑپ رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس تھا۔ اور ایشور کو صدق دل سے یاد کرکے کہہ رہا تھا کہ اگر ابکی اس مصیبت سے رہا ہو جاؤں تو پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرونگا۔

اتنے میں مالی کی نگاہ حضرت پر پڑی۔ پہلے تو کچھ گھبرایا۔ پھر نزدیک آکر بولا یہہ کون کھڑا ہے یہاں کون ہے؟"

اتنا سُننا تھا کہ کملا چرن تیزی سے باہر نکلا۔ اور پھاٹک کی طرف بگٹٹ بھاگا۔ مالی ایک ڈنڈا ہاتھہ میں لئے "لینا لینا بھاگنے نہ پاوے" کے نعرے مارتا پیچھے پیچھے دوڑا۔ یہہ وہی کملا ہے جو مالی کو انعام واکرام دیا کرتا تھا۔ اور جس سے مالی سرکار اور حضور

لکر باتیں کرتا تھا۔ وہ کملا آج اُسی مالی کے سامنے اسطرح جان بچاکر بھاگا جاتا ہے۔ گناہ آگ کا وہ کنڈ ہے جو عزّت وحرمت۔ حوصلہ و ہمّت کو دم زدن میں جلاکر راکھ کر دیتا ہے۔

کملا چرن درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں دوڑتا ہوا پھاٹک سے باہر نکلا۔ سڑک پر ٹریم جارہی تھی۔ اسپر جا بیٹھا۔ اور ہانپتے ہانپتے بیدم ہوکر گاڑی کے تختہ پر بدحواس گر پڑا۔ اگرچہ مالی نے پھاٹک تک بھی پیچھا نہ کیا۔ مگر کملا ہر ایک آنے جانیوالے پر چونک چونک کر نگاہیں ڈالتا۔ گویا سارا زمانہ اُسکا دشمن ہوگیا ہے۔ کمبختی نے ایک اور گُل کھلایا۔ اسٹیشن پر پہونچتے ہی گھبراہٹ کا مارا ریل گاڑی میں جاکر بیٹھ تو گیا۔ مگر ٹکٹ لینے کی سدھ ہی۔ اور نہ معلوم ہوا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ وہ اسوقت اس شہر سے بھاگنا چاہتا تھا۔ خواہ کہیں ہو۔ کچھ دور چلا تھا کہ ایک انگریز ریلوے افسر لالٹین لئے آتا دکھائی دیا۔ اُسکے ساتھ ایک کنسٹبل بھی تھا۔ وہ مسافروں کا ٹکٹ دیکھتا چلا آتا تھا۔ مگر کملا نے سمجھا پولیس کا کوئی افسر ہے۔ خوف کے مارے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے۔ اور کلیجہ میں دھڑکن ہونے لگی۔ جبتک وہ دوسری گاڑیوں میں معاینہ کرتا رہا تب تک تو وہ کلیجہ مضبوط کئے بیٹھا رہا۔ مگر جوں ہی اُسکے کمرہ کا دروازہ کھلا کملا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھاگیا۔ ایک وحشت کے عالم میں دوسری طرف کا دروازہ کھولکر چلتی ہوئی ریل پر سے نیچے کود پڑا۔ کنسٹبل اور ٹکٹ والے صاحب نے اُسے یوں کودتے دیکھا تو سمجھے کوئی مشّاق ڈاکو ہے۔ مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے کہ انعام الگ ملیگا اور ترقی اوپر سے ہوگی۔ فوراً سرخ لالٹین دکھائی۔ ذرا دیر میں گاڑی رک گئی۔ اب گارڈ اور کانسٹبل اور ٹکٹ والے صاحب مع چند دوسرے آدمیوں کے

گاڑی سے اُتر پڑے۔ اور لالٹین بے لے کر اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگے کسی نے کہا اب اُسکا
گرد بھی نہیں ملنے کا۔ پکا ڈکیت تھا۔ کوئی بولا ان لوگوں کو کالی جی کا ایشٹ رہتا ہے
جو کچھ نہ کر دکھائیں تھوڑا ہے۔ مگر گارڈ آگے ہی بڑھتا گیا۔ ترقی کی اُمید اُسے آگے
لئے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام پر آ پہونچا جہاں کملا گاڑی سے کودا تھا۔ اتنے
میں کانسٹبل نے خندق کی طرف اشارہ کر کے کہا دیکھو وہ سفید سفید کیا چیز ہے۔
مجھے تو کوئی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور لوگوں نے بھی دیکھا اور یقین ہو گیا کہ ضرور ہی
بدمعاش یہاں چھپا ہوا ہے۔ چلکر بچہ کو گھیر لو کہیں نکلنے نہ پاوے۔ ذرا سنبھلے ہوئے
رہنا۔ ڈاکو جان پر کھیل جاتے ہیں۔ گارڈ صاحب نے پستول سنبھالا۔ میاں کنسٹبل نے
لاٹھی تانی۔ چند مسافروں نے جوتے اُتار اُتار کر ہاتھوں میں لئے کہ کہیں وار کر بیٹھا تو
بھاگنے میں آسانی ہوگی۔ دو چار آدمیوں نے ڈھیلے اُٹھا لئے کہ دور ہی سے نشانہ لگائیں گے
ڈاکو کے نزدیک کون جاے۔ کسے جان بھاری پڑی ہے۔ مگر جب لوگوں نے نزدیک جاکر
دیکھا تو نہ ڈاکو۔ نہ ڈاکو کا بھائی۔ بلکہ ایک شریف صورت۔ سبزہ آغاز۔ چھریرے بدن کا نوجوان
بے حس و حرکت زمین پر اوندھے مُنہ پڑا ہے۔ اور اُسکے ناک اور کان سے آہستہ آہستہ
خون بہہ رہا ہے۔ برجن کا لال سرجو دیئی نے چھین کر زمین پر ٹپک دیا۔ کملا نے ادھر دم
توڑا۔ اور برجن ایک بھیانک خواب دیکھکر چونک پڑی۔ سرجو دیئی نے برجن کا سہاگ لوٹ
لیا۔ شراب محبت کا دور ایسا بند ہوا کہ نہ ساقی رہا۔ نہ ساغر۔ سب خاک میں ملگئے۔

بیسویں فصل

ہجوم غم

سہاگن عورت کے لئے اُسکا شوہر دنیا کی سب سے پیاری چیز ہوتی ہے۔ وہ اُسی کے لئے جیتی ہے۔ اور اُسی کے لئے مرتی ہے اُسکا ھنسنا بولنا اُسیکو خوش کرنیکے لئے۔ اور اُسکا بناؤ سنگار اُسیکے لُبھانے کے لئے ہوتا ہے۔ اُسکا سہاگ اُسکی مسرت اور زندگی ہے۔ اور سہاگ کا اُٹھ جانا اُسکی زندگی اور جانداری کا خاتمہ۔

کملا چرن کی بے ہنگام موت برج رانی کے لئے موت سے کم نہ تھی۔ اُسکی زندگی کی آرزوئیں اور ولولے سب مٹی میں ملگئے کیا کیا ارادے تھے۔ اور کیا ہوگیا۔ ہر دم مرنیوالے کی صورت اُسکی آنکھوں میں پھرا کرتی تھی۔ اگر ذرا دیر کے لئے آنکھیں جھپک جاتیں تو اُسکی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے آجاتی۔

بعض اوقات آفات ارضی وسماوی کو کسی خاص شخص یا خاندان سے اُنس سا ہوجاتا ہے۔ کملا چرن کا داغ مرجھانے بھی نہ پایا تھا کہ بابو شیاما چرن کی باری آپہونچی۔ شاخوں کے کاٹنے سے درخت کو مرجھاتے نہ دیکھکر ابکی آسمان نے جڑ ہی کاٹ دی۔ رامدین پانڈے بڑا کینہ ور شخص تھا۔ جبتک ڈپٹی صاحب مجگانوں میں تھے دبکا بیٹھا رہا۔ مگر جوں ہی وہ شہر کو لوٹے اسی دن سے اُسنے اودھم مچانا شروع کردیا۔ سارا گانوں کا گانوں اُسکا دشمن تھا۔ جن نگاہوں سے مجگانوں والوں نے ہولی کے دن اُسکی طرف دیکھتا تھا وہ نگاہیں۔ اور وہ تیور اُسکے کلیجہ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ جس حلقہ میں مجگانوں واقع تھا اُسکے تھانہ دار صاحب ایک بڑے گھاگ۔ آزمودہ کار راشی تھے۔

ہزاروں کی رقمیں ہضم کر جائیں۔ مگر ڈکار تک نہ لیں۔ مقدمے بنانے اور ثبوت بہم پہنچانے میں ایسے مشّاق کہ راہ چلتے آدمی کو پھانس دیں۔ اور پھر کسی کے چھوڑائے نہ چھوٹے۔ حکام سب اُنکے ہتھکنڈوں سے واقف تھے۔ مگر اُنکی ہوشیاری۔ اور معاملہ دانی کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ رادھا چرن تھانہ دار صاحب سے ملا۔ اور اپنے زخم جگر کی دوا مانگی۔ اسکے ہفتہ بھر بعد محکاؤں میں ڈاکہ پڑگیا۔ ایک مہاجن شہر سے آرہا تھا۔ رات کو نمبردار کے یہاں ٹھیرا۔ ڈاکوؤں نے اُسے لوٹکر گھر نہ جانے دیا۔ صبح کو تھانہ دار صاحب تحقیقات کو آئے۔ اور ایک ہی رسّی میں سارے گانوں کو باندھ لیگئے۔

حسن اتفاق سے مقدمہ بابو شیاما چرن کے اجلاس میں پیش ہوا۔ اُنھیں پہلے ہی سے سارا کچا چٹھا معلوم تھا۔ اور یہ تھانہ دار صاحب بہت دنوں سے اُنکی آنکھوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ایسی ایسی موشگافیاں کیں۔ اور ایسے ایسے نکتے نکالے کہ تھانہ دار صاحب کی قلعی کھل ہی گئی۔ چھ مہینہ تک مقدمہ چلا۔ اور دھوم سے چلا۔ سرکاری وکیلوں نے بڑے بڑے زور لگائے۔ مگر گھر کے بھیدی سے کیا چھپ سکتا تھا۔ نتیجہ یہہ ہوا کہ ڈپٹی صاحب نے سب ملزموں کو بے داغ رہا کر دیا۔ اور اُسی دن شام کو تھانہ دار صاحب معطل کر دیئے گئے۔

جب ڈپٹی صاحب فیصلہ سُنا کر لوٹے تو ایک ہمدرد اہلکار نے کہا حضور تھانہ دار صاحب سے ذرا ہوشیار رہئیگا۔ آج بہت جھلّایا ہوا تھا۔ پہلے بھی دو تین افسروں کو زک دیچکا ہے۔ آپ پر ضرور وار کریگا۔ ڈپٹی صاحب نے سُنا اور مسکرا کر اُس آدمی کا شکریہ ادا کیا۔ مگر اپنی حفاظت کے لئے کوئی مزید انتظام نہ کر سکے۔ اُنھیں یہہ بزدلانہ خیال معلوم ہوتا تھا۔ رادھا اہیر بہت ضد کرتا رہا کہ میں آپ کے ساتھ رہونگا۔ کاشی بھر بھی

بہت پیچھے پڑا رہا۔ مگر اُنھوں نے کسیکو ساتھ نہ رکھا۔ اور حسب معمول اپنا فرض انجام دیتے رہے۔

ظالم خاں بات کا دھنی تھا۔ وہ زندگی سے ہاتھ دھوکر بابو شیاما چرن کے پیچھے پڑ گیا۔ ایک روز وہ سیر کر کے شیو پور سے کچھ رات گئے واپس آ رہے تھے کہ پاگل خانہ کے قریب کچھ دیکھکر فٹن کا گھوڑا بدکا۔ گاڑی رُک گئی۔ اور دم زدن میں ظالم خاں نے ایک درخت کی آڑ سے نکلکر پستول کا نشانہ لگایا۔ پٹاخے کی آواز ہوئی۔ اور بابو شیاما چرن کے سینہ سے گولی پار ہو گئی۔ پاگل خانہ کے گارد کے سپاہی دوڑے۔ اور ظالم خاں کو گرفتار کر لیا۔ سائیس نے اُسے بھاگنے نہ دیا تھا۔

اس حادثہ نے خاندان کی تباہی کا سامان پورا کر دیا۔ پریموتی یوں تو بہت نیک مزاج اور محبتی عورت تھی۔ مگر ان حادثات نے اُسکے مزاج اور برتاؤ میں یکایک بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ اُسکے حواس میں فرق آگیا۔ بات بات پر برجن سے چڑھ جاتی۔ اور طعنے مارنے لگتی۔ اُسے خدا جانے کیونکر یہہ وہم ہو گیا تھا کہ یہہ سب آفت اسی بہو کی لائی ہوئی ہے یہی سبز قدم جب سے گھر میں آئی گھر ستیاناس ہو گیا۔ اسکا پَورا خراب ہے۔ کئی دفعہ اُسنے کھولکر برجن سے کہہ بھی دیا۔ کہ تمہاری چکنی صورت نے مجھے موہ لیا۔ میں کیا جانتی تھی کہ تمہارے چرن ایسے منحوس ہیں۔ برجن یہہ باتیں سنتی۔ اور کلیجہ مسل کر رہ جاتی۔ جب دن ہی برے آگئے تو بھلی باتیں کیونکر سُننے میں آئیں۔ یہہ آٹھوں پہر کی کوفت اُسے حسرت کے آنسو بھی نہ بہانے دیتی۔ آنسو نکلتے ہیں جب کوئی ہمدرد ہو اور دلسوزی کرے۔ کوفت اور لعن طعن کی آگ سے آنسو خشک ہو جاتا ہے۔

روز برجن کا جی گھر میں بیٹھے بیٹھے ایسا گھبرایا کہ وہ ذرا دیر کے لئے باغیچہ میں

چلی آئی۔ آہ اس باغیچہ میں کیسے کیسے لطف کے دن گذرے تھے۔ اِسکا ایک ایک پودھا مرنے والے کی محبت بیکراں کا یادگار تھا۔ کبھی وہ دن بھی تھے کہ ان پھولوں اور پتّیوں کو دیکھکر دل باغ باغ ہوجاتا تھا۔ اور نسیم دل پر خموں کا نشہ پیدا کردیا کرتی تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بہت سی شامیں آغوش الفت میں گذری تھیں اور جہاں شراب محبت کے دور چلے تھے۔ اسوقت پھولوں کی پنکھڑیاں اپنے نازک نازک ہونٹوں سے اُسکا خیر مقدم کرتی تھیں۔ مگر افسوس! آج اُنکے سر جھکے ہوئے تھے۔ اور زبانیں بند تھیں۔ کیا یہ وہ جگہ نہ تھی جہاں "البیلی مالن" پھولوں کا ہار گوندھتی تھی۔ مگر بھولی مالن کو کیا معلوم تھا کہ اسی جگہ اُسے اپنی آنکھوں سے نکلے ہوئے موتیوں کے ہار گوندھنے پڑینگے۔ انھیں خیالوں میں برجن کی نگاہیں اُس کنج کی طرف اُٹھ گئیں جہاں سے ایک بار کملا چرن مسکراتا ہوا نکلا تھا۔ گویا وہ پتّیوں کی جنبش اور اُسکے کپڑوں کی جھلک دیکھ رہی ہے۔ اُسکے چہرے پر اسوقت ہلکی سی مسکراہٹ نمودار تھی جیسے گنگا میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کی زرد اور ملین کرنوں کا عکس پڑتا ہے۔ یکایک پریموتی نے آکر کرخت آواز میں کہا "اب آپ کو سیر کرنیکا شوق چرّایا ہے؟"

برجن کھڑی ہوگئی اور روتے ہوئے بولی۔ "اماں جسے نارائین نے کچلا اُسے آپ کیا کچلتی ہیں"

آخر پریموتی شہر سے ایسی بیزار ہوئی کہ ایک مہینہ کے اندر سب سامان اونے پونے بیچ کر مجگانوں چلی گئی۔ برج رانی کو ساتھ نہ لیا۔ اُسکی صورت سے اُسے نفرت ہوگئی تھی۔ برجن اِس وسیع مکان میں اکیلی رہ گئی۔ مادھوی کے سوا اب اُسکا کوئی غمخوار نہ تھا۔ سُوباما کو اپنی مُنہ بولی بیٹی کی مصیبتوں کا اتنا ہی صدمہ ہوا۔ جتنا اپنی بیٹی کا ہوتا۔ کئی دن تک روتی رہی۔

اور کئی دن برابر اُسے سمجھانے کے لئے آتی رہی۔ جب برجن اکیلی رہ گئی تو سُباما نے چاہا کہ یہہ میرے یہاں اُٹھ آئے۔ اور آرام سے رہے۔ خود کئی بار بُلانے گئی۔ مستری جی کو بھیجا۔ مگر برجن کسی طرح آنے پر آمادہ نہوئی۔ اُسے خیال ہوتا تھا کہ سُسر کو دنیا سے سدھارے ابھی تین مہینہ بھی نہوا اتنی جلد یہہ مکان خالی ہو جائیگا تو لوگ کہیں گے کہ اُنکے مرتے ہی ساس اور بہو لڑ مریں۔ یہانتک کہ اُسکی اس ضد سے سُباما کا من موٹا ہو گیا۔

مجگانوں میں پرپموتی نے ایک اندھیر مچا رکھا تھا۔ اسامیوں کو سخت سُست کہتی۔ کارندہ کے سر پر جوتی پٹکدی۔ پٹواری کو کوسا۔ رادھا اہیر کی گائے زبردستی لے لی۔ یہانتک کہ گانوں والے گھبرا گئے۔ اور بابو رادھا چرن سے شکایت کی۔ رادھا چرن نے یہہ کیفیت سُنی تو یقین ہو گیا کہ ضرور ان صدمات نے اسکے حواس زائل کر دئے ہیں۔ اسوقت کسی طرح انکا دل بہلانا چاہئے۔ سیوتی کو لکھا کہ تم اماں کے پاس چلی آؤ۔ اور اُسکے ساتھ کچھ دنوں رہو۔ سیوتی کی گود میں اسوقت ایک چاند سا بچہ کھیل رہا تھا۔ اور پران ناتھ دو مہینہ کی رخصت لیکر دربھنگہ سے لوٹے تھے۔ راجہ صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری ہو گئے تھے۔ ایسے موقعہ پر سیوتی کیونکر آسکتی۔ تیاریاں کرتے کرتے مہینوں گذر گئے۔ کبھی لڑکا بیمار پڑ گیا۔ کبھی ساس روٹھ گئی۔ کبھی ساعت نہ بنی۔ آخر چھٹویں مہینہ جاکے اُسے فرصت ملی۔ اور وہ بھی بڑی منتوں کے ساتھ۔

مگر پرپموتی پر اُسکے آنے کا مطلق اثر نہوا۔ وہ اُسکے گلے ملکر بھی نہ روئی۔ اُسکے بچے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اُسکے دل میں اب محبت اور انسانیت نام کو بھی باقی نہ رہی تھی۔ جیسے گنے سے رس نکال لو تو صرف پھُضلہ رہ جاتا ہے۔ اُسی طرح جس انسان کے دل سے محبت نکلگئی وہ گوشت و پوست کا ایک تودہ رہ گیا۔ دیوی دیوتا کا نام زبان پر آتے ہی اُسکے

تیور بدل جاتے تھے۔ مجگانوں میں جنم اشٹمی ہوئی۔ لوگ ٹھاکر جی کا برت رکھے ہوئے تھے۔ اور چندہ سے ناچ کرانیکی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مگر پریموتی نے عین جنم کے موقع پر اپنے گھر کی مورتی کھیت میں پھنکوادی۔ ایکادسی برت چھوٹا۔ دیوتاؤں کی پوجا چھوٹی۔ وہ پریموتی اب پریموتی ہی نہ تھی۔

سیوتی نے جوں توں کرکے یہاں دو مہینہ کاٹا۔ اُسکی طبیعت بہت گھبراتی۔ کوئی سکھی سہیلی بھی نہ تھی جسکے ساتھ بیٹھکر دن کاٹتی۔ برجن نے تلسا کو اپنی سکھی بنا لیا تھا۔ مگر سیوتی کا مزاج امیرانہ واقع ہوا تھا۔ ایسے عورتوں سے میل جول وہ اپنے لئے باعث ننگ سمجھتی تھی۔ تلسا بیچاری کئی بار آئی۔ مگر جب دیکھا کہ یہ دل کھولکر نہیں ملتی تو آنا جانا چھوڑ دیا۔

تین مہینہ گذر چکے تھے۔ ایک روز سیوتی دن چڑھے تک سوتی رہی۔ پران ناتھ نے رات کو بہت رُلایا تھا۔ جب نیند کُھلی تو کیا دیکھتی ہے کہ پریموتی اُسکے بچے کو گود میں لئے جھوم رہی ہے۔ کبھی آنکھوں سے لگاتی ہے۔ اور کبھی چھاتی سے چپٹاتی ہے۔ سامنے انگیٹھی پر ہنڈیا پک رہا ہے۔ بچہ اسکی طرف انگلیوں سے اشارہ کر کرکے اُچکتا ہے کہ کٹورے میں جا بیٹھوں۔ اور گرم گرم حلوا چکھوں۔ آج اُسکا چہرہ کنول کی طرح کھلا ہوا ہے۔ شاید اسکی تیز نگاہوں نے تاڑ لیا ہے کہ پریموتی کے اُجڑے ہوئے دل میں پریم نے آج پھر باس کیا ہے۔ سیوتی کو یقین نہ آیا۔ چارپائی پر پڑے پڑے نیم باز آنکھوں سے تاک رہی تھی۔ گویا خواب دیکھ رہی ہے۔ اتنے میں پریموتی پیار سے بولی۔ "بیٹی اُٹھو۔ دن چڑھ آیا"۔

سیوتی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اور آنکھیں بھر آئیں۔ آج بہت دنوں کے بعد ماں کے مُنہ سے محبت کی باتیں سنیں۔ جھٹ اُٹھ بیٹھی۔ اور ماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی۔ پریموتی کی آنکھوں سے بھی آنسو کی جھڑی لگ گئی۔ سوکھا پیڑ ہرا ہوا۔ جب دونوں کے آنسو تھمے تو پریموتی

بولی "ستو۔ تمھیں آج یہ سب باتیں اچرج معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں بیٹی اب اچرج ہی ہیں ۔ میں کیسے روؤں جب آنکھوں میں آنسو ہی نہیں رہے ۔ پیار کہاں سے لاؤں جب کلیجہ سوکھ کے پتھر ہوگیا۔ یہہ سب دنوں کے پھیر ہیں۔ آنسو اُنکے ساتھ گئے۔ اور پیار کملا کے ساتھ۔ آج نہ جانے یہ دو بوند کہاں سے نکل آئے ۔ بیٹی میری خطائیں سب معاف کرنا۔"

یہ کہتے کہتے اُسکی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ سیوتی زرد ہوگئی۔ ماں کو فرش پر لٹا دیا۔ اُسدن سے پریموتی کا یہہ حال ہوگیا جب دیکھو روہی ہے ۔ باتیں کرتی تو شکر و قند گھولدیتی۔ بچے کو گود سے ایک دم کے لئے الگ نہ کرتی۔ مہریوں سے بولتی تو مُنہ سے پھول جھڑتے۔ پھر پہلے کی پریموتی ہوگئی۔ شیریں زبان۔ رحم دل اور نیک۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے دل پر سے ایک پردہ سا اُٹھ گیا۔ جب شدت کی برف پڑتی ہے تو بعض ندیاں یخ بستہ ہو جاتی ہیں۔ تب اُئیں بسنے والی مچھلیاں اور دریائی جانور چادر برف میں چھپ جاتے ہیں۔ کشتیاں پھنس جاتی ہیں اور اس خوش خرام سیم تن۔ جان نواز چشمۂ آب کی صورت بالکل نظر نہیں آتی۔ حالانکہ برف کی چادر کے نیچے وہ خواب ناز میں مست پڑا رہتا ہے۔ مگر جب گرمی کا راج ہوتا ہے تو برف پگھل جاتی ہے۔ اور دریا سے سیمیں برف کی چادر اُٹھا دیتا ہے۔ پھر مچھلیاں اور جانور آبستے ہیں کشتیوں کے بادبان لہرانے لگتے ہیں اور اسکے ساحل پر مردم و مرغ و مور کا جمگھٹ ہوجاتا ہے۔

مگر یہہ کیفیت زیادہ دنوں تک نہ قائم رہی۔ ایک ہی ہفتہ میں پریموتی کی حالت نازک ہوگئی۔ مزاج کا صحیح ہونا گویا موت کا پروانہ تھا۔ اسی مدہوشی نے اُسے ابتک اُمید حیات میں رکھا تھا۔ ورنہ پریموتی جیسی نرم دل عورت باد حوادث کے ایسے جھونکے نہ برداشت کر سکتی۔

سیوتی نے چاروں طرف تار دلوائے کہ آکر آماں کو دیکھ جاؤ۔ مگر کہیں سے کوئی نہ آیا۔ پران ناتھ کو رخصت نہ ملی۔ برجن بیمار تھی۔ رہے رادھا چرن۔ وہ

نینی تال سیر کرنے گئے ہوئے تھے۔ پرمیوتی کو بیٹے ہی کے دیدار کا اشتیاق تھا۔ مگر جب اُنکا خط آگیا کہ میں اسوقت نہیں آسکتا۔ تو اُسنے ایک لمبی سانس لی۔ اور آنکھیں موندلیں۔ اور ایسی سوئی کہ پھر اُٹھنا نصیب نہوا۔

اکیسویں فصل

نفس کی سرکشیاں

انسان کا دل ایک راز سربستہ ہے۔ کبھی تو وہ لاکھوں کی طرف آنکھ اُٹھاکر نہیں دیکھتا۔ اور کبھی چند پیسوں پر پھسل جاتا ہے۔ کبھی صدہا بیگناہوں کے خون پر اُف تک نہیں کرتا۔ اور کبھی ایک بچے کو دیکھ کر رو دیتا ہے۔ پرتاپ چندر اور کملاچرن میں اگرچہ برادرانہ محبت تھی۔ مگر کملا کی موت بے ہنگام کا جو صدمہ پرتاپ کو ہونا چاہیئے وہ نہوا۔ سُنکر وہ چونک ضرور پڑا۔ اور ذرا دیر کے لئے مغموم بھی نظر آیا۔ مگر وہ ملال جو کسی شخص کو اپنے سچے دوست کی وفات پر ہوتا ہے اُسے نہوا۔ اِس میں شک نہیں کہ شادی کے پہلے ہی سے اُسنے برجن کو اپنی بہن سمجھنا شروع کیا تھا۔ تاہم اس خیال میں اُسے پوری کامیابی کبھی نہ حاصل ہوئی۔ وقتاً فوقتاً اسکا واہمہ اس پاک رشتہ کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتا تھا۔ کملاچرن سے اُسے بذات خاص کوئی ایسی محبت نہ تھی۔ اُسکی جو کچھ خاطر و مدارات اور محبت وہ کرتا وہ کچھ تو اس خیال سے کہ برجن سُنکر خوش ہوگی۔ اور کچھ اس خیال سے کہ سوسیلا کے موت کا کفارہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے جب برجن سسرال چلی آئی تو البتہ کچھ دنوں تک پرتاپ نے اُسے اپنے خیالات میں نہ آنے دیا۔ مگر جبسے وقت سے کہ وہ اُسکی بیماری کی خبر پاکر بنارس گیا تھا۔ اور اُسکے ملاقات نے

داروے شفا کا کام کیا تھا اسیوقت سے پرتاپ کو یقین ہو گیا تھا کہ برجن کے دل میں کملا نے وہ جگہہ نہیں پائی جو میرے لئے مخصوص تھی۔

پرتاپ نے برجن کو نہایت پردرد ماتم نامہ لکھا۔ مگر خط لکھتا جاتا تھا۔ اور سوچتا جاتا تھا کہ اسکا اُسپر کیا اثر ہو گا۔ بالعموم ہمدردی محبت کو مضبوط کرتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ یہہ خط ہی اپنا کام کر جاوے۔ علاوہ اسکے چونکہ وہ ذرا مذہبیت کی طرف زیادہ مائل تھا کملا کی موت نے یہہ خیال پیدا کیا کہ ایشور نے میری محبت کی قدر کی اور کملا چرن کو میرے راستہ سے ہٹا دیا۔ گویا یہہ غیب سے پروانہ ملا ہے کہ اب میں برجن سے اپنی محبت کی داد لوں۔ پرتاپ یہہ تو جانتا تھا کہ برجن سے کسی ایسے بات کی امید کرنا جو اخلاق اور صداقت کے راستہ سے جو بھر بھی ہٹی ہوئی ہو حماقت ہے۔ مگر اخلاق اور صداقت کے دائرہ میں رہتے ہوئے میری خاطرداری اور دلدہی اگر ممکن ہے تو برجن زیادہ عرصہ تک میرے ساتھ بیرحمی نہیں کر سکتی۔ جب میں آنکھوں میں آنسو بھر کر۔ اور عاجزی سے منت کرونگا تو وہ ضرور میری طرف مخاطب ہو جائیگی۔ اور وقت محبت اور عاشقانہ خاطرداریاں اپنا اپنا کام پورا کر کے رہینگی۔

ایک مہینہ تک یہہ خیالات اُسے بیچین کرتے رہے۔ یہانتک کہ برجن سے ایک بار پوشیدہ ملاقات کرنے کا بیتابانہ اشتیاق اُسے پیدا ہوا۔ یہہ وہ جانتا تھا کہ ابھی برجن کے دل پر تازہ صدمہ ہے۔ اور میری کسی بات یا انداز سے اگر میرے نفس کی سرکشیوں کی بو نکلی تو پھر برجن کے نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے گر جاؤنگا۔ مگر جیسے کوئی چور روپیہ کا ڈھیر دیکھکر صبر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح پرتاپ اسوقت اپنے تئیں تھام نہ سکا۔ انسان کی قسمت ایک بڑی قعوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ موقعے اُسے نیک بھی بناتے ہیں اور بد بھی۔ جب تک

کملاچرن زندہ تھا پرتاپ کے نفس کو کبھی اتنا سر ابھارنے کا موقع نہ ملا۔ اسکی موت نے گویا جگہ خالی کر دی۔ یہہ خود غرضی کا نشہ یہانتک بڑھا کہ ایک روز اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ برجن مجھے یاد کر رہی ہے۔ اپنی بیتابی سے وہ برجن کی بیتابی کا اندازہ لگانے لگا۔ بنارس جانے کا ارادہ مصمم ہوگیا۔

دو بجے رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نیند نے سارے شہر پر ایک گھٹاٹوپ چادر پھیلادی تھی۔ کبھی کبھی پیڑوں کی سنسناہٹ سنائی دیجاتی تھی۔ دھواں مکانوں اور درختوں پر ایک سیاہ غلاف کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ اور سڑک کی لالٹینیں دھوئیں کی سیاہی میں ایسی نظر آتی تھیں جیسے بادل میں چھپے ہوئے تارے۔ پرتاپ چندر ریل گاڑی سے اُترا تو اُسکا دل بانسوں اچھل رہا تھا۔ اور ہاتھ پاؤں کانپتے تھے۔ یہہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ گناہ کا اُسے تجربہ ہوا۔ افسوس! کہ دل کی یہہ کیفیت عرصے تک قائم نہیں رہتی۔ نفس اس منزل دشوار کو طے کرلیتا ہے۔ جس شخص نے کبھی شراب نہیں پی۔ اُسے اسکی بو سے نفرت ہے۔ شاید پہلی بار وہ پئیگا تو گھنٹوں اُسکا منہ بدمزہ رہیگا۔ اور وہ تعجب کریگا کہ کیوں لوگ ایسی ہرپلی اور کڑوی چیز کے ایسے گرویدہ ہیں۔ مگر چند ہی دنوں میں اُسکی نفرت غائب ہوجاتی ہے۔ اور وہ بھی آب سرخ کا غلام ہوجاتا ہے۔ گناہ کا مزہ شراب سے بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

پرتاپ چندر اندھیرے میں آہستہ آہستہ جارہا تھا۔ اُسکے قدم جلد جلد نہیں اُٹھتے تھے کیونکہ گناہ نے اُسکے پیروں میں بیڑیاں ڈالدی تھیں۔ اُس ولولہ آمیز مسرت کا جو ایسے موقعوں پر قدموں کو تیز کردیتی ہے اُسکے چہرہ پر کوئی نشان نہ تھا۔ وہ چلتے چلتے رُک جاتا۔ اور پھر کچھ سوچکر آگے بڑھتا تھا۔ شیطان اُسے گناہ کے غار میں کیسا کھینچے لئے جاتا ہے۔

پرتاپ کا سر دھم دھم کر رہا تھا۔ اور خوف سے پنڈلیاں کانپ رہی تھیں۔ سوچتا بچارتا۔

گھنٹہ بھر میں وہ منشی شیاما چرن کی عالی شان حویلی کے سامنے سکے جا پہونچا۔ آج تاریکی میں یہ حویلی بہت ہی بھیانک معلوم ہوتی تھی جیسے گناہ کا بھوت سامنے کھڑا ہو۔ پرتاپ دیوانکی آڑ میں کھڑا ہوگیا کسی نے اُسکے پیر باندھ دیئے۔ آدھ گھنٹہ تک وہ یہی سوچتا رہا کہ لوٹ چلوں۔ یا اندر جاؤں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائیگا۔ برجن مجھے دیکھکر دل میں کیا سوچیگی۔ کہیں ایسا نہو کہ میری یہہ حرکت مجھے ہمیشہ کے لئے اُسکی نظروں سے گرادے۔ مگر ان سب اندیشوں پر شیطان کی کشش غالب آئی۔ نفس کی بس میں ہوکر انسان کو نیک و بد کی تمیز نہیں باقی رہ جاتی۔ اُسنے دل کو مضبوط کیا۔ اور اس بزدلی پر اپنے تئیں ملامت کرنے لگا۔ بعد ازاں مکان کے عقب کی طرف جاکر۔ باغیچہ کی چہار دیواری سے اندر پھاند پڑا۔ باغیچہ سے مکان کے اندر جانے کے لئے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اتفاق سے وہ اسوقت کھلا ہوا تھا۔ پرتاپ کو اسوقت یہہ ایک فال نیک سا معلوم ہوا۔ مگر فی الواقعی یہہ خانہ معصیت کا دروازہ تھا۔ اندر جاتے ہوئے پرتاپ کے ہاتھ پاؤں تھرتھرانے لگے۔ دل میں ایسی غضب کی دھڑکن تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ سینہ سے باہر نکل پڑیگا۔ اُسکا دم گھٹتا تھا۔ ایمان نے ایک بہت زور لگایا۔ اپنی ساری قوت صرف کردی۔ مگر نفس کا پُرزور دھاوا نہ رُک سکا۔ پرتاپ دروازہ کے اندر داخل ہوا۔ اور آنگن میں تلسی کے چبوترہ کے پاس۔ چوروں کی طرح کھڑا سوچنے لگا کہ برجن سے کیونکر ملاقات ہو۔ مکان کے سب دروازے بند ہیں۔ کیا برجن بھی یہاں سے چلی گئی۔ یکایک اُسے ایک بند دروازہ کے درازوں سے ہلکی روشنی کی شعاع دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اُسکے جگرنے ایسی قلانچ بھری گویا ہوا میں اُڑ جائیگا۔ دبے پاؤں اسی طرف چلا۔ اور دراز میں آنکھ لگاکر اندر کی کیفیت دیکھنے لگا۔ اُسکی سانس اسوقت بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔

برجن ایک سفید ساڑی پہنے۔ چہرہ زرد۔ بال بکھرے ہوئے۔ فرش پر ہاتھ میں

قلم لئے بیٹھی تھی۔ اور دیوار کی طرف دیکھ دیکھکر کاغذ پر کچھ لکھتی جاتی تھی۔ جیسے کوئی شاعر بحر خیال سے موتی نکال رہا ہو۔ قلم کو دانتوں تلے دبا کر کچھ سوچتی اور لکھتی۔ اور ذرا دیر کے بعد دیوار کی طرف تاکنے لگتی۔ پرتاپ بہت دیر تک سانس روکے ہوئے یہہ دلچسپ نظارہ دیکھتا رہا۔ نفس اُسے بار بار ٹھوکے دیتا۔ مگر یہہ ایمان کا آخری قلعہ تھا۔ اسوقت ایمان کا شکست کھا جانا گویا پہلوے دل میں شیطان کا جگہہ پانا تھا۔ ایمان اور نتائج کے خوف نے اسوقت پرتاپ کو اُس غار میں گرنے سے بچا لیا جہاں سے مرتے دم تک اُسے نکلنا نصیب نہوتا۔ بلکہ یہہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ غار معصیت سے بچانیوالا اس وقت ایمان نہ تھا۔ بلکہ نتائج کا خوف اور پشیمانی کا خیال۔ لبسا اوقات جب ہمارا ایمان مغلوب ہوجاتا ہے تو نتائج کا خوف ہمکو بدکرداریوں سے بچا لیتا ہے۔ برجن کے چہرہ پر باوجود زردی کے ایک ایسی رونق تھی جو قلب کی صفائی اور خیال کے بلندی کا پتہ دیرہی تھی۔ اُسکے بشرے کی متانت اور نگاہ کی پاکیزگی میں نفس سرکش کے لئے وہ جانگداز تازیانہ تھا جس سے پرتاپ کے نفس کا جانبر ہونا محال تھا۔ کیونکہ راہ معصیت میں اُسکا یہہ پہلا سفر تھا۔ وہ ایسا موثر ہوا کہ رونے لگا۔ نفس نے جتنے خیالات فاسد اُسکے دل میں پیدا کر دیئے تھے وہ سب اس نظارہ نے یوں غائب کر دیئے جیسے اُجالا اندھیرے کو دور کر دیتا ہے۔ اسوقت اُسے یہہ خواہش ہوئی کہ اِسکے پیروں پر گر کر اپنے خطاؤں کی معافی مانگ لوں۔ جیسے کسی مہاتما سنیاسی کے روبرو جاکر ہمارے دل کی کیفیت ہوجاتی ہے۔ اسی طرح پرتاپ کے دل میں خودبخود اعزاز و احترام کے خیالات پیدا ہوئے۔ وہ اپنی اخلاقی پستی پر ایسا نادم ہوا کہ برجن کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی۔ شیطان یہانتک لایا۔ مگر آگے نہ لیجا سکا۔ وہ اُلٹے قدم لوٹا۔ اور ایسی تیزی سے باغچہ میں آیا۔ اور چہار دیواری سے باہر کودا گویا کوئی اُسکے تعاقب میں ہے۔

صبح کاذب کا وقت ہو گیا تھا۔ پرتاپ کے ایمان کی طرح آسمان میں تارے جھلملا رہے تھے۔ اور چکّی کی گھمر گھمر آواز کانوں میں آتی تھی۔ پرتاپ پیر دباتا۔ آدمیوں کی نظریں بچاتا گنگا جی کی طرف چلا۔ یکایک اُسنے سر پر ہاتھ رکھا تو ٹوپی کا پتہ نہ تھا۔ اور نہ جیب میں گھڑی دکھائی دی۔ اُسکا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ اور دل سے بے اختیار ایک آہ نکل آئی۔

بعض اوقات ہماری زندگی میں ایسے واقعات ہو جاتے ہیں۔ جو دم زدن میں اُسکی صورت پلٹ دیتے ہیں۔ کبھی والدین کی ایک ترچھی نگاہ بیٹے کو نیکنامی کے ساتویں آسمان پر پہونچا دیتی ہے۔ اور کبھی بیوی کی ایک نصیحت شوہر کو مہاتما رشی بنا دیتی ہے۔ غیرتمند ہستیاں اپنے یگانوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو کر دنیا کا بوجھ بننا نہیں برداشت کر سکتیں۔ انسانی زندگی میں ایسے موقعے خداداد ہوتے ہیں۔ پرتاپ چندر کی زندگی میں بھی وہ مبارک وقت تھا جب وہ پیچدار گلیوں میں ہوتا ہوا گنگا کے کنارے آکر بیٹھا۔ اور افسوس و ندامت کے آنسو بہانے لگا نفس کی حوصلہ انگیزیوں نے اُسے ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ مگر اُسکے لئے یہہ تازیانہ اُستاد مہربان کا تازیانہ ثابت ہوا۔ کیا یہہ تجربہ نہیں کہ زہر بھی بعض اوقات آب حیات کا کام دیتا ہے۔

جسطرح ہوا کا جھونکا سلگتی ہوئی آگ کو دہکا دیتا ہے اسیطرح اکثر دلوں میں دبے ہوئے جوش کو متحرک کرنے کے لئے کسی ظاہری تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی مصیبت کا تجربہ۔ اور دوسروں کی مصیبت کا نظارہ لبا اوقات دل میں وہ دیرآگ پیدا کر دیتا ہے جو صحبت مطالعہ اور خلقی مناسبت کے اثر سے بھی ممکن نہ تھا۔ اگرچہ پرتاپ چندر کے دل میں نیک اور بےغرض زندگی بسر کرنیکا خیال پہلے ہی سے تھا۔ مگر نفس کے اس تازیانہ نے وہ منزل ایک ہی لمحہ میں طے کر دی جسکے طے ہونے میں برسوں لگتے۔ اُسکی زندگی کا ارادہ مستقل ہو گیا معمولی صورتوں میں قومی خدمت اُسکی زندگی کا ایک دلچسپ اور غالباً ضروری

مشغلہ ہوتی۔ مگر ان واقعات نے قومی خدمت کو اُسکی زندگی کی غرض اور غائت بنا دیا۔ سُباما کی دلی آرزو پورے ہونے کے سامان پیدا ہو گئے۔ کیا ان واقعات کی تہ میں کوئی غیبی طاقت متحرک تھی۔ کون کہہ سکتا ہے۔

بائیسویں فصل

ہردوار سے بہت دور شمال کی طرف پیچدار پہاڑوں میں۔ ایک چشمہ کے کنارے ایک نوجوان بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ جگہہ بہت خوفناک تھی۔ درندے دن دھاڑے چہل قدمیاں کرتے تھے۔ مگر یہہ شخص شب و روز ایک ہی چٹان پر بیٹھا رہتا۔ وہ جگر کا بہت مضبوط تھا۔ اُسکے چہرے سے وحشت برستی تھی۔ کپڑے پھٹ کر تار تار ہو گئے تھے۔ بال بڑھ آئے تھے۔ مگر ظاہرا ان باتوں کی اُسے مطلق پروا نہ تھی۔ اُسکے پاس نہ اوڑھنا تھا نہ بستر۔ نہ برتن نہ بھانڈے۔ کبھی کبھی جنگلی پھل کھا لیا کرتا تھا۔ ایسا بے سروسامان آدمی کسنے دیکھا ہوگا۔ یہہ پرتاپ چندر تھا۔

پرتاپ چندر کو یوں بسر کرتے کئی مہینے گذر گئے ہیں۔ وہ اپنے نفس سے لڑ رہا ہے۔ مگر فتح نہیں ہوتی۔ اُسنے دشمن کو جیسا حقیر سمجھا تھا اُس سے بدرجہا طاقتور پایا۔ جسوقت تک وہ الٰہ آباد میں تھا ذاتی عیش اور تنعم کے خیالات اُسکے دل میں نام کو بھی نہ آتے تھے۔ مگر اس ویرانے میں اُسکا خیال بار بار انھیں باتوں کی طرف جھکتا۔ وہ خیالات کے مجتمع کرنے میں کامیاب نہوتا۔ اکثر ایک نازنین کی تصویر اُسکی نگاہوں کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی جو

برجن سے بہت مشابہہ تھی۔ تخیل ایک عالی شان مکان بناتا۔ اُسے شیشہ آلات و نوادر سے سجاتا۔ جاں بخش نغموں کی میٹھی الاپ کانوں میں آنے لگتی۔ عاشقانہ چھیڑ چھاڑ اور معشوقانہ شیریں اداؤں کے دور چلنے لگتے۔ گھنٹوں اسی پُرسرور خواب کے مزے لوٹتا۔ پھر یکایک وہ چونک پڑتا کہ میں کیا بیہودہ باتیں سوچ رہا ہوں۔ اور خیالات کو ادھر سے ہٹا کر مسئلہ پیش نظر پر جماتا۔ مگر جھرنوں کی شیریں نوائیاں۔ اور غزالوں کی کلیلیں خیالات کے قدم میں زنجیر گرانبار کا کام کرتیں۔ یہانتک کہ وہ مایوس ہو کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اور دل میں کہتا کہ میری زندگی یوں ہی خواب دیکھنے میں گذریگی۔

رفتہ رفتہ اُسکی یہہ حالت ہو گئی کہ کھانے پینے کی مطلق سُدھ نہ رہتی۔ سویرے سے شام تک دیوانہ وار بیٹھا ہوا درختوں کی شاخوں اور پتھر کی چٹانوں سے نظریں ملایا کرتا۔ خیال کی طاقت بڑی زبردست ہے۔ قومی خدمت کے خیال میں غرق رہتے رہتے اُسکے دل میں درد کا سچا جذبہ پیدا ہوا جسکے بغیر بیغرض خدمت محال ہے۔ کسی بوڑھے ضعیف آدمی کو لکڑیاں توڑتے دیکھتا تو خود اُسکی لکڑیاں توڑ کر اُسکے گھر تک پہونچا آتا۔ بھولے بھٹکے مسافروں کو ساتھ لیکر آبادی تک جاتا۔ ان کاموں میں اُسے روحانی مُسرت حاصل ہوتی یہانتک کہ آس پاس کی آبادیوں میں ان نیک کاموں کا شہرہ ہو گیا۔ لوگ سمجھنے لگے کہ کوئی مہاتما رشی ہیں۔ عورتیں آتیں کہ مجھے سال بھر سے لڑکا نہیں ہوا۔ کوئی دعا تعویذ دیجئے۔ مرد آتے کہ میرے روزگار کی فکر کر دیجئے۔ آخر پرتاپ چندر یہاں سے گھبرا کر بھاگا۔ اور دشوار گذار گھاٹیوں کو چیرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ یہاں ایک اونچی چوٹی پر چھوٹی سی منڈھیا تھی۔ اُسکے قریب ایک چٹان پر اُسنے بھی اپنا آسن جمایا۔

یہاں رہتے اُسے چھہ مہینے گذر گئے۔ اور اب اُسے اپنے دل میں ایک باطنی طاقت

محسوس ہونے لگی۔ جذب خیال کی قوت پیدا ہو گئی۔ مگر اُسکی آتما ابھی تک کمزور تھی۔
اِسکا ثبوت بھی اُسے جلد ملگیا۔ ایک روز شام کیوقت وہ بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک شیر کی ہولناک
گرج اُسکے کانوں میں آئی۔ آواز سنتے ہی اُسکے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور دل دھڑکنے
لگا۔ مگر وہ سنبھل بیٹھا۔ اور ادھر اُدھر چوکنی نگاہوں سے تاکنے لگا کہ آواز کدھر سے آئی۔
کیا دیکھتا ہے کہ ایک خونخوار شیر چشمہ کے کنارے ایک بے بس ہرن پر لوٹ پڑا ہے۔
اور اپنے آہنی جبڑے اُسکے گردن میں چبھا رہا ہے۔ اُسکی آنکھوں سے چنگاریاں نکل
رہی ہیں۔ یہہ ہیبتناک نظارہ دیکھتے ہی پرتاپ چندر کا ہیاؤ چھوٹ گیا۔ وہ بے اختیاری
طور پر اُٹھا کہ مندر میں جا چھپوں۔ مگر اسی اثنا میں ایک لاغر اندام شخص جسکی ریش دراز ناف
تک آئی ہوئی تھی۔ اور چہرہ بدر کامل کی طرح منور تھا۔ ہاتھ میں ایک گنڈا سا لئے ہوئے نکلا
اور دلیرانہ وار قدم بڑھاتا ہوا شیر کے سر پر جا پہونچا۔ شیر جھلّایا تو تھا ہی۔ شعلہ بار آنکھوں
سے گھورتا ہوا دوڑا۔ مگر نزدیک آتے ہی اُسکی آنکھیں جھپک گئیں۔ اور ایک خطاوار شخص
کی طرح جو اپنے آقا سے معافی کا طالب ہو زمین پر لیٹ گیا۔ سادھو نے آہو نیمجان کو آغوش
میں اُٹھا لیا۔ اور مندر میں لاکر مرگ چھالے پر لٹا دیا۔ چند بوٹیاں پتھر پر گھسکر اُسکے زخموں
پر لگائیں۔ اور تب اپنی کفنی کو جسپر تازہ گلہائے خون زیب دے رہے تھے دھونے کے لئے
چشمے کی طرف چلے۔ جیسے کوئی شیو کا پوجاری کمل کے پھولوں کو جل دان کے لئے
لیجاتا ہو۔ پرتاپ اِس حیرت انگیز روحانی کرشمہ سے اتنا موثر ہوا کہ کچھ دیر تک نقش دیوار کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا
پھر سوچنے لگا افسوس! کیا میری آتما اتنی کمزور ہے۔ کیا مجھے اپنی جان اتنی پیاری ہے!

پرتاپ چندر اپنی اس بزدلی پر ایسا جھنجھلایا کہ آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ خون جوش
کھانے لگا۔ ایک مضبوط لکڑی کا کندہ اُٹھا کر۔ کسی بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑاتی ٹانگوں سے

دوڑتا ہوا شیر کے کلّے پر جا پہونچا۔ شیر نے اُسے دیکھا اور دیکھتے ہی اُسکے تیور بدل گئے۔ بادل کی طرح گرجا۔ اور قریب تھا کہ جست مار کر پرتاپ کی گردن دبوچ کر اتنے میں اُسنے لکڑی کا کندہ اپنی پوری طاقت سے اُسکے سر پر پٹک دیا۔ مگر شیر کے فولادی سر پر اسکا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ اور بھی جھلّایا۔ اور اس زور سے گرجا کے جنگل کے تمام جانور اپنے اپنے کمین گاہو نسے نکل پڑے۔ اور دونوں اگلے پنجے اُسکی کمر میں ڈالدیئے۔ دفعتاً اُسکے سر پر گنڈاسے کا بھرپور ہاتھ پڑا۔ طیش کھا کر پیچھے کی طرف دیکھا تو سادھو بابا کھڑے ہیں۔ اُسنے فوراً پرتاپ کو چھوڑ دیا اور درد سے کراہتا بھاگا۔

پرتاپ چندر نے اِن باباجی کو اکثر مندر سے آتے جاتے دیکھا تھا۔ مگر اسوقت جو نزدیک سے اُسکے پرجلال چہرہ پر نگاہ ڈالی تو صورت کچھ مانوس معلوم ہوئی۔ سوچنے لگا کہ میں نے انھیں کہاں دیکھا ہے۔ مگر حافظہ نے یاری ندی۔ ندامت سے سر جھکا کر بولا "مینے آپکو کہیں اور دیکھا ہے"۔

سادھو جی نے مسکرا کر فرمایا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ برسوں آپکی گود میں کھیلا ہوں"۔ اتنا سُنتے ہی پرتاپ کے آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا۔ کلیجہ نے جست ماری اور لبوں تک آپہونچا۔ ایک پُرجوش فرزندانہ بیخودی کے ساتھ اُنکے سینے سے لپٹ گیا۔ اور آنکھوں سے آنسو کے قطرے گرنے لگے۔ منشی سنجیون لال نے پدرانہ شفقت سے اُسکے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور آنسو پونچھے۔
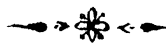
تیسویں فصل

تیاری

جیسے کوئی منجدھار میں پڑی کشتی طوفان کے تھپیڑوں اور تلاطم کے جھکولوں سے اپنی جان بچا کر کسی بندرگاہ کے آغوش میں جا پہونچتی ہے اُسی طرح پرتاپ چندر اب ایک ایسے مسکن میں آگیا تھا جہاں اُسکے دماغ کو اطمینان تھا اور دل کو قرار۔ وہ اب اُس بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح نہ تھا جو اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہو۔ اب اُسے اپنا راستہ۔ اُسکے نشیب و فراز اور منزل مقصود صاف نظر آتے تھے۔ منشی سجیون لال کی صحبت اور تلقین نے چند ہی مہینوں میں اُسکے دل سے وہ کمزوریاں محو کر دیں جنھیں وہ سخت کوششوں کے بعد بھی دور کرنے میں پورے طور پر کامیاب نہ ہوا تھا۔ ایک عارف کامل کی چند روزہ صحبت تزکیہ نفس کے لئے برسوں کی اندرونی کشمکش اور مطالعے سے بدرجہا زیادہ مفید ہوتی ہے۔

منشی جی اُسے ہر روز بھگوت گیتا پڑھاتے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی بحر عمیق کی غواصی میں صرف کیا تھا۔ ادھر تین چار سال تک کتنے ہی یوگیوں اور سنیاسیوں کے خرمن دانش سے خوشہ چینی کی تھی۔ وہ ایک ایک نکتہ کی ایسی تشریح کرتے۔ اُنکا لہجہ ایسا دلکش اور طرز بیان ایسا سرور انگیز تھا کہ پرتاپ پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا۔ اُنکے ایک ایک لفظ میں وہ اثر ہوتا تھا جو کسی خانقاہ روحانیت کے بسنے والے ہی کی باتوں میں ہو سکتا ہے۔ پرتاپ چندر کے خیالات روز بروز زیادہ

پاک - زیادہ بیغرض - اور حوصلے زیادہ وسیع اور زیادہ بلند ہوتے جاتے تھے - اُسنے یوگ کی مشق بھی شروع کردی تھی جوں جوں اس میدان میں وہ قدم آگے بڑھاتا تھا اُسکی ہمدردیاں زیادہ وسیع اور عام ہوتی جاتی تھیں -

اسطرح دو سال گذر گئے - پرتاپ چندر کے تو اعضا جسمانی شیروں کی طرح مضبوط اور تنومند ہو گئے - اونچی سے اونچی پہاڑیوں پر بے تکان چڑھ جاتا - منزلوں کی مسافت طے کرکے یوں آ بیٹھتا گویا کسی باغ کی سیر کر کے لوٹا ہے - قوت برداشت اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ برفستانی چوٹیوں پر سنگین چٹانوں کا بستر بنا کر ایسے آرام سے لیٹتا گویا آراستہ مکان میں مخملی گدوں پر لیٹا ہوا ہے - اُسکا چہرہ ایسا روشن ہو گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھپک جاتی تھیں - اُسپر شانوں تک بکھرے ہوئے بال اور درد سے بھری ہوئی آنکھیں اُسے رحم کی مورت بنائے دیتی تھیں - روشن رخساروں پر سبزہ نودمیدہ ایسے معلوم ہوتے تھے گویا پروانے شمع پر نثار ہو رہے ہیں - کیسا حسن مردانہ تھا - کہ پہلی ہی نظر میں اُسکی تصویر پردۂ دل پر ہمیشہ کے لئے کھنچ جاتی تھی - یقیناً جب وہ اپنا آسن بچھا کر یوگ سادھن کرتا ہوگا تو کیلاس کی بسنے والی اپسرائیں اُسپر نثار ہوتی ہونگی -

جسوقت وہ جڑی بوٹیوں کا بقچہ لیکر قدم بڑھاتا ہوا چلتا تو پہاڑوں کے بسنے والے مرد اور عورتیں اضطراری طور پر اُسکے روبرو سر جھکاتے - اور جسوقت تک جھاڑیاں اور چٹانیں اُسے اپنے دامنوں میں چھپا نہ لیتیں اُسکی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا کرتے - اُسکے علاج میں وہ تاثیر تھی - باتوں میں وہ مٹھاس اور آنکھوں میں وہ جادو کہ گرد و نواح کے لوگ سمجھتے وہ دیولوک کا کوئی رشی ہے -

ایک روز سجیون لال نے پرتاپ چند سے کہا بالانندجی! چلو تمھیں اب دوسرے

مقامات کی سیر کراؤں۔ اس پاک سرزمین میں کتنے ہی سنیاسی اور رشی دنیا سے منہ موڑکر بھگوت بھجن کر رہے ہیں۔ میں نے ایکبار سب کے درشن کر لیے ہیں۔ مگر اب پھر انکے درشنوں کے لیئے جی بے چین ہو رہا ہے۔

پرتاپ "میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ یہاں سے کسطرف کا قصد ہے؟"

سجیون لال "پہلے سنت دھام کو چلیں گے۔ وہاں کئی مہاتماؤں کے درشن ہونگے وہاں سے پورب کی طرف کیلاش ہے۔ کیلاش سے سیدھے گیان سرور کی طرف سدھاریں گے۔ ایسا دلکش مقام پردہ زمین پر اور کہیں نہوگا۔ عین ساگر کے کنارے شری برھمانندجی کا دھام ہے۔ اُن کے قدموں پر سر جھکائیں گے مجھے کتنے ہی رشیوں سے فیض صحبت کا موقع ملا ہے۔ مگر برھمانندجی تاروں میں چاند ہیں۔ تمھیں دیکھکر وہ بہت خوش ہونگے۔

پرتاپ چندر نے روانگی کی تیاری کرنی شروع کی۔ اور تیاری ہی کیا تھی۔ دو مرگ چھالے جڑی بوٹیوں کا لچھہ۔ اور چند کتابیں اس مسکین کی ساری کائنات تھی۔ انھیں اُس نے بغل میں دبایا۔ اور دونوں آدمی چل کھڑے ہوئے۔ مگر ابھی پہاڑی سے اُترے بھی نہ تھے کہ جنگلی جانوروں کے غول کے غول پیچھے چلا تے اُچھلتے کودتے نظر آئے۔ ہرن۔ بکریاں۔ ریچھ۔ شیر۔ چیتے۔ سب کے سب پہلو بہ پہلو بھاگے چلے آتے تھے۔ گویا ہر ایک اپنے دھن میں ایسا مست تھا کہ اُسے دوسرونکی خبر نہ تھی۔ آن کی آن میں اِن جانوروں نے دونوں بھگوڑوں کے گرد حلقہ باندھ لیا۔ کوئی اُنکے ہاتھ چاٹنے لگا۔ کوئی پیروں پر سر رگڑنے لگا۔ کوئی دردناک آواز میں چیخ رہا تھا۔ کوئی اکڑوں بیٹھا ہوا زمین کی طرف تاک رہا تھا۔ گویا اپنے محسن کی جدائی کا صدمہ اظہار کی قابلیت سے بہت زیادہ دلدوز

تھا۔ بے زبانوں کے دل میں بھی وہی جذبہ محبت اور وہی صدمہ فراق ہوتا ہے۔ جو حضرت انسان کی زندگیاں تلخ کر دیا کرتا ہے۔ اگرچہ اُسکا اظہار صرف اُنھیں لوگوں کے روبرو ہوتا ہے جنکی اندرونی آنکھیں کھُلی ہوئی ہیں۔ اور جنکی آتمائیں اسقدر وسیع ہیں۔ کہ جسم ظاہر کی نیرنگیاں اُنکا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اس کوہستان کے ایک ایک ذی روح سے اِن دونوں آدمیوں کو سچی ہمدردی تھی۔ اُنکا مسکن اِن بے زبانوں کے خوش فعلیوں کا اکھاڑہ تھا۔ اور اُنکے ننھے ننھے خوبصورت بچّوں کے سونے کا گہوارہ۔ اور کلیلیں کرنیکا میدان اس پُر سحر حلقہ میں آکر اُنکی باہمی رنجشیں اور کدورتیں مٹ جایا کرتی تھیں۔

شام ہو گئی تھی۔ اور دونوں آدمی مردانہ وار قدم بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کوہستان کے ایک ایک گوشہ کا نقشہ اُنکی نگاہ میں کھنچا ہوا ہے۔ نہ اُنکے قدم پھسلتے تھے۔ نہ ڈگمگاتے تھے۔ تیرہ و تار وادیاں جہاں شاید کسی ذی روح نے قدم نہ رکھا ہو۔ اور عمودی چوٹیاں جسکی بلندی کو پرندے بھی نگاہ حسرت سے دیکھیں اُنکے لئے ایسے آسان اور سہل گذار راستے تھے جیسے کوئی صاف ستھری سڑک۔ یا کسی باغ کی روش۔ اُنکے دل مردوں کے دل تھے۔ اور اعضا شیروں کے۔ پرتاپ کا تو عنفوان شباب تھا۔ مگر شستی جی بھی باوجود پیرانہ سالی کے ایک چٹان سے دوسری چٹان پر بے دھڑک کود جاتے۔ اور پُر شور کوہستانی نالوں میں بے محابا گھس پڑتے۔ گویا ان موانعات ظاہر کی اُنکی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں تھی۔

اسطرح بادیہ پیمائی میں کئی مہینے لگے۔ دن بھر راستہ چلتے۔ اور رات کے وقت کسی مہاتما رشی کے استھان پر ٹھہر جاتے۔ اور اُسکے ست سنگ سے فیضیاب ہوتے۔ پرتاپ چندر کو اکثر یہہ خیال گذرتا کہ اگر یہہ فقرا ءِ قدسی صفات قوم کی خدمت کی طرف متوجہ

پریم چند کو ہم دنیا کے سب سے بڑے افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑا کر سکتے ہیں

ہوتے تو مکر و فریب۔ جور و جبر کا نشان مٹا دیتے۔ کیسے روشن دل لوگ تھے اکیسے مستغنی!
دولت و شہرت۔ ثروت و جاہ۔ نام و نمود اور دوسری دنیاوی نعمتیں جو حضرت انسان کی
زندگی کا معراج خیال کی جاتی ہیں اُنکی نگاہوں میں محض سنگریزے تھے جو حقیقت کے
موتی۔ اور معرفت کے ہیروں کے پاسنگ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ آخر منزل طے ہوئی۔ اور گیان
سرور کے نواح میں آپہونچے آہ! کیسا سہانا منظر تھا۔ اُسے دلکش کہنا اُسکی مذمت کرنا
ہے۔ اگر دنیا میں کوئی جگہہ ایسی ہے جسے اُسکی آنکھ کہہ سکیں تو وہ کوہ ہمالہ ہے۔ اور یہ جگہہ
اُس آنکھ کی پتلی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے پرانوں میں دیولوک کا مقدس نام دیا گیا ہے۔
یہاں گندھرپ اور اپسرائیں بستی ہیں۔ اور اُنکے بہشتی نغموں کی دلاویز صدا شوق کے
کانوں میں آتی ہے۔ پرتاپ پر اس منظر نے خود مستی کی کیفیت طاری کر دی۔ نگاہیں جدھر
جاتیں اُدھر سے ہٹنے کا نام نہ لیتیں۔ روح اور قلب پر ایک تقدس آمیز رعب چھا رہا تھا۔
کوئی کیسا ہی بے اعتقاد شخص کیوں نہو۔ مگر اس پاک سرزمین میں داخل ہوتے ہی اُسکی
روح پر وہ سرور ہوگا جو اُسے مدت العمر یاد رہیگا۔ یہاں کی ہوا میں سانس لینا۔ اور یہاں
کے زمین پر قدم رکھنا جام روحانیت سے شاد کام ہوتا ہے۔ دونوں طرف۔ جہانتک نگاہ
جاتی ہے۔ سر بہ فلک پہاڑیوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ ایک کے اوپر ایک۔ ایک دلپذیر
بیقاعدگی کے ساتھ لدی ہوئی ہیں۔ گویا آسمان پر منڈلانے والے بادل یہاں سیر کرنے
کے لئے اُتر آئے ہیں۔ اُنکی چوٹیوں پر جا بجا برف کے تودے پڑے ہوئے ہیں۔ جنھیں
آفتاب کی آخری شعاعوں نے زرنگار بنا دیا ہے۔ جیسے اتنی بلندی پر روحان بہشتی کے
لئے سنہرے تخت سجائے گئے ہوں۔ انھیں پہاڑیوں کے بیچ میں گیان سرور آہستہ
آہستہ موجیں مار رہا ہے۔ گیان کی طرح اتھاہ اور اپار۔ اُسمیں ہنس اور بط اور بگلے

خوش فعلیاں کر رہے ہیں۔گویا آسمان پر تارے نکلے ہوئے ہیں۔

یکایک منشی سجیون لال نے کہا۔" بالاجی دیکھو جھیل کے کنارے وہ چھوٹی سی کٹی جو نظر آرہی ہے وہی برہمانندجی کا استھان ہے۔" یہہ سنتے ہی اشتیاق نے پرتاپ چند کے قدم اور بھی تیز کر دیئے۔ذرا دیر میں دونوں آدمی کٹی کے دروازے پر پہونچ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سوامی برہمانندجی جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے سندھیا کرنے میں مصروف ہیں۔انکا چہرہ ایسا پُرجلال ہے گویا آفتاب ابھی ابھی گیان سرور کے آغوش سے نکل آیا ہے۔

چوبیسویں فصل

برجن شاعرہ ہوگئی

جب سے منشی سجیون لال تیرتھ جاترا کو نکلے۔اور پرتاپ چندر الہ آباد چلا گیا اُسوقت سے سشباما کی زندگی کی روش بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔اُسنے ٹھیکہ کے کاروبار کو ترقی دینا شروع کیا۔اور اُسے نہایت وسیع پیمانے پر پہونچا دیا۔مستری جی بدستور دیانت اور ہوشیاری سے اپنا کام کرتے تھے۔منشی سجیون لال کے زمانے میں بھی کاروبار کو اتنا فروغ نہ حاصل ہوا تھا۔سشباما رات کی رات بیٹھے اینٹ پتھر سے سر مارا کرتی۔اور سُرخی چونے کے فکر میں پریشان رہتی۔پائی پائی کا حساب جانچتی۔اور کبھی کبھی خود مزدوروں کے کام کی دیکھ بھال کرتی۔ان کاموں میں اُسے ایسا انہماک ہوا کہ دان اور برت سے جو اُسکے پُرانے شغل تھے کسی قدر لاپروائی

ظاہر ہونے لگی۔ باوجود روزافزوں آمدنی کے سُباما نے خرچ کی کوئی مد زیادہ نہونے دی۔ کوڑی کوڑی دانتوں سے پکڑتی اور یہہ سب اس لئے کہ پرتاپ چندر صاحب مال ہوجائے اور اپنی زندگی بھر فارغ البال و خوشحال رہے۔

سُباما کو اپنے ہونہار بیٹے پر ناز تھا۔ اسکی زندگی کی رفتار دیکھ دیکھکر اُسے یقین ہوگیا تھا کہ جو آرزو دل میں رکھکر بیٹے اولاد مانگی تھی وہ آرزو ضرور پوری ہوگی۔ وہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسروں سے پرتاپ کا حال خفیہ طور پر دریافت کیا کرتی۔ اور اُنکی رپورٹوں کا مطالعہ اُسکے لئے ایک دلچسپ فسانہ تھا۔ ایسی صورت میں الہ آباد سے پرتاپ چندر کے لاپتہ ہوجانے کا تار پہونچنا گویا دل و دماغ پر بجلی کا گرنا تھا۔ سُباما نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور سر تھام کر بیٹھ گئی۔ تیسرے دن پرتاپ چندر کی کتابیں۔ کپڑے اور دوسرے اسباب بھی آپہونچے۔ یہہ زخم پر اور چرکا تھا۔

ایک دن وہ پرتاپ چندر کی کتابیں اُلٹ پلٹ رہی تھی کہ اُسے ایک ریشمی رومال میں بہت سے خطوط حفاظت سے لپٹے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہہ برجن کے خطوط تھے سُباما اُنھیں پڑھنے لگی۔ اور ایک ایک کرکے سارا دفتر ختم کرڈالا۔ آج وہ بہت روئی۔ دوسرے دن جب برجن نے خبر سُنی تو وہ گھبرائی ہوئی سُباما کے یہاں آئی۔ سُباما نے چٹھیوں کا پلندا اُسکے سامنے پھینکدیا۔ اور مُنہ پھیر لیا۔ برجن کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ وہ اُٹھکر کھڑی ہوگئی۔ اور پر غرور لہجہ میں بولی "چچی۔ اس بدگمانی پر آپ بہت پچھتائیں گی"۔ یہہ کہکر وہ اُلٹے قدم اپنے گھر لوٹ آئی۔

پریموتی کے مرنے کی خبر پاتے ہی پران ناتھ پٹنہ سے۔ اور رادھا چرن نینی تال سے روانہ ہوئے۔ اُسکے جیتے جی آتے تو ملاقات ہوتی۔ مرنے پر آئے تو مٹی دیکھنی بھی نصیب ہوئی۔

مرتک سنسکار سب بڑی دھوم سے ادا کیے گئے۔ وہ ہفتہ گانوں میں خوب چہل پہل رہی۔ اسکے بعد رادھاچرن مرادآباد چلے گئے۔ اور پران ناتھ نے پٹنہ چلنے کی تیاری شروع کی۔ انکا ارادہ تھا کہ بیوی کو الٰہ آباد پہونچاتے ہوئے پٹنہ جائیں۔ مگر سیوتی نے ضد کیا کہ جب یہانتک آئے ہیں تو برجن کے پاس بھی ضرور چلنا چاہئے۔ ورنہ اُسے صدمہ ہوگا سمجھیگی کہ مجھے بکیس سمجھکر ان لوگوں نے بھی تیاگ دیا۔ للّو نے بہت حیلہ و حجّت کی کہ مجھسے جواب طلب ہوجائیگا معطل ہوجاؤنگا۔ کیا عجب ہے کہ تنزلی کی بھی نوبت آجائے۔ آخر سیوتی نے انکا ہاتھ پکڑکر اُنکی طرف اس التوکھی نگاہ سے دیکھا جسمیں مایوسی بھی تھی۔ اور محبت بھی۔ ضد بھی تھی۔ اور رضا بھی۔ للّو اس نگاہ سحر کار کی تاب نہ لاسکے۔ رضا نے وہ کام کر دکھایا جو ضد سے مشکل تھا۔ بیوی کے گلِ عارض کا بوسہ لیکر بولے "رو دیں کیوں؟"

سیوتی: "تم رُلانے لگے ہی ہو"

پران: "اچھا تمہارا ہی کہنا کرینگے۔ لو اب خوش ہو جاؤ۔"

للّو مدہوش ہوگیا۔ اُس نگاہ میں خمو لکا نشہ تھا۔ اِسی نگاہ نے گھر تباہ کر دیئے ہیں گلوں پر خنجر چلوا دیئے ہیں سلطنتیں مٹا دی ہیں۔ للّو نے تو کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا۔ صرف ایک معزز عہدہ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک ننھی سی آنکھ میں کتنی طاقت ہے!

سیوتی کا اس خانہ ویران میں آنا گویا پھولوں میں مہک کا آنا تھا۔ ہفتہ بھر کے لئے اچھے دنوں کی بو باس آگئی۔ برجن بہت خوش ہوئی۔ اور خوب روئی۔ مادھوی نے منّو کو گود میں لیکر خوب سا پیار کیا۔ مردانے کمرے مہینوں سے بند تھے۔ آج اُنکی قسمتیں بھی کھلیں۔ اُجڑا ہوا آشیانہ بسا۔

پریموتی کے چلے جانے کے بعد برجن اس گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ صرف مادھوی اُسکی

انیس و غمخوار تھی۔ اس تنہائی۔ سوز جگر اور درد دل نے اُسکا وہ ذاتی جوہر ٹٹولکر شمع کی طرح چھپا ہوا تھا۔ اور جسنے اُسکے نام کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرنے لگی۔ شاعری سچے جذبات کی تصویر ہے۔ اور سچے جذبات خواہ وہ درد کے ہوں۔ یا مسرت کے۔ اسیوقت دل میں پیدا ہوتے ہیں جب ہم درد یا مسرت کا مزہ چکھتے ہیں۔ اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد اُنکا زبانِ قلم تک آنا تو ایک آسان بات ہے۔ برجن ان دنوں رات کی رات بیٹھے بیٹھے اپنے خیال کے موتی پرویا کرتی۔ اُسکا ایک لفظ سوز اور ویراگ کا ایک ایک دفتر ہوتا تھا۔ دوسرے شاعروں کے دل میں دوستوں کی واہ واہ۔ اور سخن سنجوں کے سبحان اللہ سے ولولے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر برجن اپنی داستان غم اپنے ہی دل کو سناتی تھی۔ اُسکے بلند خیالوں کی داد دینے والی شمع خاموش تھی۔ اور سمند فکر کو تازیانہ لگانے والی بیکسی۔

سیوتی کو آئے دو تین دن گذرے تھے۔ ایک دن اُسنے برجن سے کہا میں تمھیں اکثر کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا پاتی ہوں۔ اور کچھ لکھتے بھی دیکھتی ہوں۔ مجھسے نہ بتاؤگی؟ برجن شرما گئی۔ بہانہ کرنے لگی کہ کچھ نہیں۔ یوں ہی جی کچھ کھویا سا رہتا ہے۔ سیوتی نے کہا میں نہ مانونگی۔ یہ کہکر وہ برجن کا صندوقچہ اُٹھا لائی۔ جس میں شاعری کے آبدار موتی رکھے ہوئے تھے۔ مجبور ہوکر برجن نے اُسے اپنی تازہ نظم سُنانی شروع کی۔ مُنہ سے پہلے مصرعہ کا نکلنا تھا کہ سیوتی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور جب تک ساری نظم نہ ختم ہوئی وہ نقش حیرت بنی بیٹھی رہی۔ پران ناتھ کی صحبت نے اُسمیں سخن فہمی کا مادہ پیدا کر دیا تھا۔ ہر تازہ مصرعہ سے اسکے گوشۂ جگر میں ایک کسک سی ہوتی تھی۔ اور آنکھیں بھر بھر آتی تھیں۔ جب برجن خاموش ہوئی تو ایک سماں بندھا ہوا تھا۔ جیسے کوئی دلکش نغمہ بند ہوگیا ہو۔ سیوتی نے برجن کو گلے لگا لیا۔ اور دوڑی ہوئی للو کے پاس گئی۔ جیسے کوئی بچہ نیا کھلونا پاکر خوشی سے دوڑتا ہوا اپنے ہمجولیوں کو دکھانے

جائے۔ پران ناتھ اپنے آقائے نامدار کو عرضی لکھ رہے تھے کہ میری والدہ سخت بیمار ہو گئیں۔ اسوجہ سے حاضر خدمت ہونے میں دیر ہوئی۔ اُمیدوار ہوں کہ ایک ہفتہ کی اتفاقیہ رخصت عطا فرمائی جاوے۔ سیوتی کو دیکھ کر چپٹ اپنی درخواست چھپا دی۔ اور مُسکرائے۔ انسان کیسا مکّار ہے۔ اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے نہیں چوکتا۔

سیوتی:۔ "ذرا اندر چلو۔ تمھیں برجن کی کبتا سنواؤں۔ پھڑک اُٹھو گے۔"

پران:۔ "اچھا اب اُنھیں کبتا کا شوق ہوا ہے۔ انکی بھاوج بھی تو گایا کرتی تھیں۔ تم تو شیام بڑے بے فکر ہو۔"

سیوتی:۔ "ذرا چلکر سُنو تو۔ پیچھے ہنسنا۔ مجھے تو اسکی شاعری پر اچنبھا ہو رہا ہے۔"

پران:۔ "چلو ایک خط لکھکر آتا ہوں ابھی۔"

سیوتی:۔ "اب یہی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں آکے کاغذ نوچ ڈالونگی۔"

سیوتی پران ناتھ کو کشاں کشاں لے آئی۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ برجن نے کوئی معمولی بھجن بنایا ہوگا۔ اسیکو سُنانے کے لئے بیقرار ہو رہی ہوگی۔ مگر جب اندر آکر بیٹھے اور برجن نے شرماتے ہوئے اپنی پُرزور نظم "پریم کی متوالی" پڑھنی شروع کی تو حضرت کی آنکھیں کُھل گئیں۔ نظم کیا تھی۔ درد دل کا ایک دریا اور راز اُلفت کا ایک دفتر تھا۔ لٹو سُنتے تھے۔ اور وجد میں آ آکر جھومتے تھے۔ الفاظ کی ایک ایک نشست پر خیال کی ایک ایک پرواز پر بے اختیار دل سے داد نکلتی تھی۔ اُنھوں نے بہت سے شاعروں کے کلام دیکھے تھے مگر یہ بلند پروازی۔ یہ تازگی۔ یہ جذبہ کہیں نظر نہ آیا تھا۔ اُسوقت کا سا سماں بندھا ہوا تھا جب طلوع آفتاب کے قبل بادِ نسیم لہراتی ہوئی چلتی ہے کلیاں کھلتی ہیں۔ پھول مہکتے ہیں۔ اور آسمان پر ہلکی سُرخی چھا جاتی ہے۔ ایک ایک شعر میں گلہائے تازہ کی شوخی اور شبنم کی تازگی موجود تھی۔ اُسپر برجن کا سُریلا پن۔ اور آواز کی گرمی

نشہ پر بادِ صبا کا کام کر رہی تھی۔ آہ! یہ وہ اشعار تھے جنہیں برجن نے دل کو شمع کی طرح جلایا تھا۔ للّو تمسخر کی نیت سے آئے تھے۔ مگر جب وہ اٹھے ہیں تو واقعی ایسا محسوس ہوتا تھا۔ گویا پہلو سے دل نکل گیا۔ ایک روز انھوں نے برجن سے کہا "تمہارا کلام چھپے تو خوب مقبول ہو" برجن نے سر جھکا کر کہا مجھے یقین نہیں کہ کوئی اسکی قدر کرے۔

پران ناتھ۔ "ایسا ممکن ہی نہیں۔ اگر دلوں میں کچھ بھی احساس باقی ہے تو تمہارے کلام کی ضرور قدر ہوگی۔ اگر ایسے لوگ موجود ہیں جو پھولوں کی مہک سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ جو چڑیوں کی چہک اور چاندنی رات کے سہانے پن کا لطف اٹھا سکتے ہیں تو وہ تمہاری کبتا کو ضرور دل میں جگہ دینگے۔"

برجن کے دل میں وہ گدگدی پیدا ہوئی جو ہر ایک مصنف کو اپنے فکرِ سخن کی داد ملنے اور اپنے کلام کے مقبول و مطبوع ہونے کے خیال سے ہوتی ہے۔ تاہم وہ نہیں نہیں کرتی رہی۔ مگر وہ نہیں ہاں کے برابر تھی۔ الٰہ آباد سے اُن دنوں "کملا" نام کا اچھا رسالہ نکلتا تھا۔ پران ناتھ نے "پریم کی متوالی" کو وہاں بھیجدیا۔ ایڈیٹر صاحب ایک نکتہ سنج بزرگ تھے۔ دل کھولکر کلام کی داد دی۔ اور جب یہ متوالی نازنین کملا کے روشوں میں رنگین لباس پہنکر نکلی تو لوگوں نے اُسے دلوں میں بٹھایا اور آنکھوں میں جگہ دی۔ شاید ہی کسی شاعر کی فکر اولیں کو ایسی قبولیت عام نصیب ہوئی ہو۔ لوگ پڑھتے۔ اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے۔ سخن فہم حلقوں میں ہفتوں تک متوالی نازنین کے چرچے رہے۔ کسی کو یقین ہی نہ آتا کہ یہ ایک گمنام شاعرہ کا کلام ہے۔ فیصلہ یہی تھا کہ اس شاعر کو الہام ہو گیا ہے۔

اب ماہ بماہ کملا کے صفحے برجن کے کلام سے مزین ہونے لگے۔ اور "بھارت مہلا" کو پسندِ عام نے شاعری کے مسندِ اعزاز پر جا بٹھایا۔ بھارت مہلا کا نام بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ گیا۔ کوئی اخبار

یا رسالہ ایسا نہ تھا جو بھارت مہلا کے کلام سے اپنے تئیں نہ سنوارتا ہو۔ اخبار کھولتے ہی ناظرین کی انکھیں بھارت مہلا کو ڈھونڈھنے لگتیں۔ ہاں اسکی آتش بیانیاں اب کسی کو حیرت میں نہ ڈالتیں۔ اسنے خود شاعری کا معیار اونچا کر دیا تھا۔ قلمرو سخن کی رانی کے لئے کمال شاعری خواہ وہ کتنا ہی اعلی کیوں نہو ایک لازمی امر تھا۔ نہ کہ قابل حیرت۔

تین سال تک کسی کو کانوں کان خبر نہوئی کہ بھارت مہلا کون ہے۔ آخر پران ناتھ سے نہ رہا گیا۔ برجن سے انھیں سخن فہمانہ عقیدت ہوگئی تھی۔ اور وہ مہینوں سے اسکے حالات زندگی لکھنے کی فکر میں پریشان تھے۔ سیوتی کے ذریعہ سے رفتہ رفتہ اسکے سوانح زندگی سب دریافت کر لیے اور "بھارت مہلا" کے عنوان سے ایک پرزور مضمون لکھا۔ پران ناتھ نے پہلے کبھی کوئی مضمون نہ لکھا تھا۔ مگر فرط عقیدت نے انکے قلم کو تیز اور فصیح بنا دیا تھا۔ عبارت اول سے آخر تک چست۔ اور خیالات پاکیزہ تھے۔

اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ برجن کو ہر چہار طرف سے قدردانی کے نذرانے ملنے لگے۔ رادھا چرن مرادآباد سے اسکی ملاقات کو آئے۔ کملا۔ اُمادیئی۔ سیتا۔ چندر کنور۔ اور کتنی ہی پرانی سکھیاں جنھوں نے یاد بھلا دی تھی۔ ہر روز برجن کے درشنوں کو آنے لگیں۔ بڑے بڑے صاحب نظر روسا۔ جو خودداری کے شان میں حکام کے روبرو بھی سر نہ جھکاتے تھے برجن کے دروازہ کی زیارت کو آتے تھے۔ چندرا خود تو نہ آسکی مگر خط میں لکھا جی چاہتا ہے کہ تمہارے پیروں پر سر رکھکر گھنٹوں روؤں۔ برجن کے دروازہ پہ ہر دم ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔

پچیسویں فصل

امتحان

منشی سنجیون لال اور پرتاپ چندر جوں ہی سوامی برہمانند جی کے روبرو پہونچے کہ انھوں نے چونک کر دیکھا۔ انکی بڑی بڑی آنکھیں نور حقیقت سے ایسی ہی لبریز تھیں جیسے گیان سروراب مصفا سے۔ دونوں نو وارد دل نے اُنکے قدم آنکھوں سے لگائے۔ سوامی جی نے اُنھیں اُٹھاکر چھاتی سے لگالیا اور منشی جی سے دیر تک سفر کی کیفیتیں پوچھتے رہے۔ بعد ازاں مسکراکر پرتاپ کی طرف دیکھا۔ اور فرط شفقت سے اُسکے سر پر ہاتھ رکھکر بولے۔ "تھک تو نہیں گئے"

پرتاپ چندر کچھ جواب نہ دیسکا۔ اُسے اسوقت وہ سرور قلب ہو رہا تھا جسکا مزہ دل لیتا ہے۔ مگر زبان نہیں کہہ سکتی۔ جسوقت وہ سوامی جی کے سینہ سے لپٹا ہے اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پریم کے دریائے بے پایاں میں غوطہ لگا رہا ہوں۔ اسکا دل اور دماغ خود بخود کسی پُرزور کشش سے کھنچا ہوا چلا جاتا تھا۔ جیسے کوئی کشتی لہروں کی رَو میں لنگر تُڑاکر بہہ جاتی ہے۔ وہی کیفیت اُسکی ہو رہی تھی۔ کلیجہ تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ اُسے حیرت ہوتی تھی کہ میری یہہ حالت کیوں ہوئی جاتی ہے۔ حسن و عشق کی کشش کا اُسے کچھ تجربہ ہو چکا تھا۔ مگر اسوقت محبت کا جو پُر سرور غلبہ اُسکی روح پر ہو رہا تھا وہ خیال اور فکر اور تمیز کے اندازے سے باہر تھا۔

مگر یہہ کیفیت صرف پرتاپ ہی کی نہ تھی۔ منشی جی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ سوامی برہمانند جی

کی پر نور آنکھیں بھی آب گوں ہو گئی ہیں۔ اور انکے روشن چہرہ پر جو سرور اور عافیت کی تصویر تھا پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ کیوں؟ کیا کشتی نے دریا میں ہلچل ڈالدی۔ اور دریا بھی وہ جسکی تھاہ نہیں۔ ایسا تو کہیں ہوتے نہیں دیکھا۔

دوسرے دن سوامی جی نے بالکرام کو ویدوں کی تلقین کرنی شروع کی۔ ایسے عارف کامل کے روبرو زانوئے ارادت تہہ کرنا وہ موقع تھا جسپر فرشتے بھی ناز کریں تو بجا ہے۔ جسوقت وہ زبان مبارک سے۔ اپنے دلربا لہجہ میں۔ وید کے رچاؤں کی تشریح کرنے لگتے۔ تو ہوا کی چڑیاں۔ اور کوہ بیاباں کے جانور یوں آکر جمع ہوتے گویا کسی نے اُنپر جادو کر دیا ہے۔ درختوں کا جھومنا بند ہو جاتا۔ مانسرور کی لہریں تھم جاتیں۔ ساری فطرت پر ایک مدہوشی کا عالم چھا جاتا۔ کلام پاک کے یہ ادنیٰ کرشمے ہیں۔ سوامی جی کے خیالات کیلاس کی چوٹیوں سے بھی زیادہ بلند اور گیان سرور کے سطح بلورین سے بھی زیادہ روشن تھے۔ حقائق معرفت پر جب تقریر فرماتے تو معنی کا دریا بہا دیتے۔ ادب اور فلسفہ کے بادشاہ تھے۔ مبارک تھیں وہ راتیں جب سوامی جی ایک مرگ چھالے پر مانسرور کے لب آب لیٹتے۔ اور ویاس اور والمیک کے پاکیزہ خیالات کی داد دیتے۔ حیرت تو یہ تھی کہ اس کنج عافیت میں بھی سوامی جی علم اور تہذیب کی تازہ تریں رفتار سے آگاہ تھے۔ اور اکثر جدید علمی انکشافات اور نظری تحقیقات پر ایسے پُروزن خیالات کا اظہار کرتے کہ پرتاپ دنگ رہ جاتا۔ اس کٹی کے آستانے پر دنیا کے کتنے ہی علما و فضلا نے جبہ سائی کی تھی۔ اور کتنے ہی سیاح و مدبر۔ فلسفی اور شاعر ہر سال اس مقام کی زیارت کو آیا کرتے تھے۔ یورپ کے مصالح ملکی کی کتنی ہی گتھیاں اسی گیان سرور کے کنارے سلجھائی گئی تھیں۔ اور تاریخ و فلسفہ کے کتنے ہی عقدے یہاں حل ہوئے تھے۔ پرتاپ چندر کو یہاں یورپ کے بعض نامور علما سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور بہت سی ایسی تصنیفیں دیکھنے میں آئیں جو الٰہ آباد کے کتب خانوں میں بھی نظر نہ آئی تھیں۔

یہ اُن زائرین کی یادگاریں تھیں جو وقتاً فوقتاً یہاں آئے تھے۔ اور جب کبھی دنیا کے کسی حصہ میں کسی صیغۂ علم پر کوئی معرکے کی کتاب لکھی جاتی تو خود مصنف یا سوامی جی کا کوئی معتقد اُسے ضرور یہاں بھیجدیا کرتا۔ ایک بادشاہ تھا کہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا دور دراز کے ممالک سے علم و تحقیقات کے خراج لیا کرتا تھا۔ مادی سلطنت ایک محدود شے ہے۔ مگر روحانی سلطنت دنیا سے بھی زیادہ وسیع۔ اور وسعت سے بھی زیادہ فراخ ہے۔ تخت زرنگار کی فقیری بوریئے کے سامنے کوئی ہستی نہیں۔ پرتاپ چندر نے اپنے عقل و ذہن کا دامن اِس علم و ہنر کے کان سے خوب آزادی کے ساتھ بھرا۔ اور یورپ کے کئی زبانوں کا بھی ماہر ہوگیا۔

پانچ سال گذر گئے۔ گرمی کے دن تھے کوہ اور دریا نے گرمی سے تنگ آکر اپنے سفید لباس اُتارنے شروع کیے تھے۔ آسمان کا نیلاپن آنکھوں میں کھُبا جاتا تھا۔ چاروں طرف دلفریب ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک روز پرتاپ چندر گیان سرور کے کنارے یوگ سادھن میں مصروف تھا کہ سوامی جی نے منشی سجیون لال سے کہا۔

"میرے خیال میں بالاجی کو اب یہاں زیادہ ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کئی دن سے سوچ رہا ہوں کہ انھیں رخصت کر دوں۔ مگر اُنسے کچھ ایسی محبت ہوگئی ہے کہ جدائی کا خیال شاق گذرتا ہے۔ آپ کو میری اس کمزوری پر تعجب ہوتا ہوگا۔ مگر میں آج آپ سے کہتا ہوں کہ پرتاپ چندر میرا بیٹا ہے۔"

سجیون لال۔ (حیرت سے) "ایں!"

سوامی جی۔ "اسی خیال سے آپ میری کمزوری معافی کے قابل سمجھیں۔ پہلے ہی جب میری نگاہ اُسکے چہرہ پر پڑی تو پرانی محبت تازہ ہوگئی۔ اور میں ضبط و استقلال سے کام نہ لیتا تو یقین تھا کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ اور راز افشا ہو جاتا۔ آج پورے بیس سال گذرے

جب میں نے دنیا سے مُنہ موڑا۔ اُسوقت کی تصویر آج بھی میری نگاہوں میں کھنچی ہوئی ہے۔ جب میں شام کے وقت شُبا ماسے رخصت ہوا ہوں۔ پرتاپ چھ سالوں کا بھی نہوا تھا۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ مینے اُسکے طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔ اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ مگر پرماتما کے سوا اور کون جان سکتا ہے کہ اُسے اپنے خیال سے دور رکھنے کے لئے میں نے کتنے ضبط اور ترک سے کام لیا۔ برسوں تک ہر دم اُس کی موہنی صورت آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی تھی۔ بارے ایشور کی دیا سے میں نفس پر غالب ہوا۔ اور اٹھارہ برسوں تک پرتاپ ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دھیان میں نہیں آیا۔ مگر جوں ہی آپ کے ساتھ اُسے دیکھا پُرانی یاد تازہ ہو گئی۔ مجھے اپنے ویراگ پر گھمنڈ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب مایا کا میرے دل میں گذر نہیں ہو سکتا۔ مگر بالا جی نے میرا یہہ غرور چُور چُور کر ڈالا۔ میں اتنے دنوں کے یوگ سادھن کے بعد بھی آج ایک کمزور انسان ہوں۔ یہہ تعلق محض جسمانی نہیں۔ بلکہ روحانی ہوتا ہے۔ اور یوگ۔ تپ۔ ویراگ کوئی بھی اس تعلق کو نہیں توڑ سکتا۔"

سجیون لال۔ "مہاراج! آپ نے جو کچھ کر دکھایا وہ بھی معجزہ سے کم نہیں۔ شُباما جیسی دیوی۔ پرتاپ جیسا بیٹا ہر شخص نہیں تیاگ سکتا۔"

سوامی جی۔ "مترِ یہہ سب ایشور کی رچنا تھی۔ مجھے شروع ہی سے اپنے بھائیوں کی بھلائی کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ اور جو کچھ میرے کئے ہو سکتا تھا۔ اُس سے اُنکی خدمت کرتا رہتا تھا۔ مگر یہہ دلی آرزو تھی کہ ایشر میرے گھر میں کوئی قوم کا فدائی پیدا کرتا۔ ایشور سے ہمیشہ یہی پرارتھنا کیا کرتا۔ آخر لکشمی جی نے شُباما کو درشن دیا۔ اور شُباما نے مہارانی سے مُنہ مانگا بردان پایا۔ اسی رات کو مجھے بھی ویراگ کا سندیسا ملا۔"

سجیون لال "ایشور کی لیلا اپار ہے۔ اگر مہاراج ویراگ نہ پاتے تو بالاجی آج کس کی سرن لیتے۔

سوامی جی "بالاجی ابھی تہ پر نہیں پہونچے ہیں۔ اور نہ میں انھیں جتانا مناسب سمجھتا ہوں۔ ورنہ وہ یہاں سے جانا ہرگز منظور نہ کرینگے۔ دیکھئے اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے کیسا حیرت انگیز کام کیا ہے۔ اس سن میں ایسا ضبط اور یوگ مینے نہیں دیکھا۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایسے بیٹے کا باپ ہوں"

سجیون لال۔ "پچھلے دنوں کونٹ پنڈلشام سے انھوں نے راج نیت پر جو مباحثہ کیا اُسے سُنکر میں حیرت میں آگیا"

سوامی جی۔ "یہہ کونٹ علما میں سر آمد روزگار سمجھے جاتے ہیں"

سجیون لال۔ "مجھے لنکا میں ایکبار انسے ملنے کا اتفاق ہوا تھا"

سوامی جی۔ "خیر علم تو ایک ایسی چیز ہے جو شوق و شغف سے روز بروز ترقی پا سکتی ہے۔ مگر اسوقت بالاجی کو ہمیشہ کے لئے رخصت کرنے سے پہلے میں یہہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ انکے دل میں کمزوری تو نہیں باقی ہے مجھے تجربہ ہے کہ بعض آدمی مدت تک ویراگ میں رہنے کے بعد یکایک ناگفتہ بہ کمزوریاں کر بیٹھتے ہیں۔ خصوصاً اس ویراگی کے لئے جو دنیا میں رہکر اُس سے الگ رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو انتہا درجہ کے مضبوط دل کی ضرورت ہے۔ ہم اور آپ اس کنج خلوت میں بیٹھے ہوئے دنیا کی گمراہیوں اور لغزشوں سے بچے رہ سکتے ہیں۔ مگر پانی پر کنول بن جانا اس سے بدرجہا مشکل بات ہے"

سجیون لال۔ "مجھے یقین کامل ہے کہ کوئی دنیاوی طاقت بالاجی کو فرض اور حق کے راستے نہیں پھیر سکتی"

سوامی جی:۔ "خیال تو میرا بھی ایسا ہی ہے مگر یقین جب ہی ہو سکتا ہے جب ایکبار انھیں آزما لوں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اُنکا یہ ضبط اور ترک ارادی ہے یا طبیعت ثانی۔ قوم کی خدمت پہلے تو ایک تپسیا معلوم ہوتی ہے۔ مگر دنوں کے ساتھ ناخدائے قوم کا ظاہری اعزاز و اقتدار بڑھتا جاتا ہے۔ یہانتک کہ اُسکے روبرو بادشاہوں کی گردنیں بھی جھکنے لگتی ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ جو آنکھیں شمشیر برہنہ کے سامنے بھی نہیں جھپکیں وہ مئے گلفام کے ایک پیالہ سے سرشار ہو گئی ہیں۔ اور جو دل سختیوں اور آفتوں کے طوفان سے بھی نہیں ڈرے وہ مدارات و عنایات کے خوشگوار تھپکیوں میں نہ سنبھل سکے۔"

سجیون لال:۔ "اسکا امتحان کیونکر ہو گا؟"

سوامی جی:۔ "ہم اور آپ ملکہ بالا جی کے نفس پر زور ڈالیں گے۔ آپ کو اسلئے شریک کرنا چاہتا ہوں کہ میں تنہا غالباً اُنکی آتما پر کچھ اثر نہ پہونچا سکونگا۔ اُنکی یوگ شکتی ان دنوں بہت بڑھی ہوئی ہے۔"

پرتاپ چندر گیان سرور کے کنارے اپنے خیال میں مگن بیٹھا ہوا تھا کہ اُسے کچھ غنودگی سی معلوم ہوئی۔ اور جھائیاں آنے لگیں۔ مگر اُسنے چونک کر آنکھیں ملیں۔ اور اپنے خیالوں میں غرق ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسپر پھر غنودگی کا غلبہ ہوا۔ اور آنکھیں جھپکنے لگیں۔ جیسے کوئی رات بھر کا جاگا ہوا آدمی صبح کے وقت نیند سے متوالا ہو جائے۔ پرتاپ کو تعجب ہوا کہ آج مجھے اتنی نیند کیوں آرہی ہے۔ اُسنے پانی کے چھینٹے منہ پر دیئے۔ اور دل میں مضبوط ارادہ کر لیا کہ اب نیند کو ہرگز نہ آنے دونگا۔ لیکن آدھ گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ پھر وہی کیفیت ہوئی۔ آنکھیں خواب گراں سے مخمور ہو کر مندنے لگیں۔ اور انگڑائیوں کے مارے اعضا ٹوٹنے لگے۔ پرتاپ کے سمجھ میں نہ آیا کہ میری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دیر تک تیزی سے

ٹہلتا رہا - بعدازاں اپنی جگہہ پر آبیٹھا -

اسطرح نیند نے اسپر چھ ناکام حملے کئے - ایک سے ایک پُرزور - مگر ساتواں حملہ پرتاپ سے برداشت نہ ہوسکا - آنکھیں بند ہوگئیں - اور گردن جُھک گئی - اُسکی آتما ایکبار مغلوب ہوگئی -

مدہوشی کا غلبہ ہوتے ہی پرتاپ چندر کو ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی پُرفضا باغ میں آگیا ہوں - عنبر بیز ہوائیں چل رہی ہیں - اور ہر ایک درخت پر خوشرنگ - اور شیریں نوا چڑیاں بیٹھی چہک رہی ہیں - ہوا میں کچھ ایسی فرحت ہے - طیور کے شیریں نوائیوں میں وہ مستانہ پن اور پھولوں کی مہک میں وہ نشہ - کہ دل ودماغ متوالے ہوئے جاتے ہیں - بہار اپنی دلفریبیوں کے پورے سامان لیکر آپہونچی ہے - پرتاپ متحیر تھا کہ میں اس جنت کدہ میں کیونکر آپہونچا - ابھی تو میں گیان سرور کے کنارے بیٹھا ہوا تھا - کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں - یہہ سوچکر اُسنے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا - اور بخوبی یقین کرلیا کہ یہہ خواب نہیں ہے - ضرور میں بھٹک کر کسی کے باغیچہ میں چلا آیا -

وہ ادھر اُدھر روشوں میں ٹہلنے لگا - کہ دفعتاً ایک نازنین سایہ دار درختوں کی آڑ سے خراماں خراماں آتی ہوئی دکھائی دی - اُسپر حُسن کا روپ تھا - اور نزاکت کا سنگار - وہ روشنی کی ایک تصویر معلوم ہوتی تھی - پرتاپ چندر کو دیکھتے ہی وہ ٹھٹکی - اور چشم پُرنم سے دیکھکر بولی " پرتاپ! "

پرتاپ چندر نے اسے پہچان لیا وہ برج رانی تھی مگر اُس آب ورنگ کے ہر جبین سے بدرجہا بہتر ہو کر بولا برجن تم یہاں کہاں؟ رانی " جہاں تم ہو وہاں میں بھی ہوں - محبت نے تمھارا پتہ بتا دیا - اگر تم مہک بنکر بھی پھول میں سما جاتے تو میں تمہیں ڈھونڈھ نکالتی تمھیں شاید معلوم نہیں - میں سنے وہ وصل

جنم لیا ہے"

پرتاپ -(حیرت سے) "دوسرا جنم"

برج رانی "ہاں ابکی میرا جنم دیولوک میں ہوا ہے - مگر یہاں بھی جب سے ہوش سنبھالا ہے تمہارے بیوگ میں گھل رہی ہوں یہ میرے باپ کا باغ ہے - تمہارا استھان یہاں سے بہت قریب ہے - تمھیں معلوم نہیں مگر میں دن میں کئی بار تمہارے درشن کرتی رہی ہوں - میرے بھاگ اچھے تھے کہ اس لوک میں جنم ہوا ایشر نے شاید میری آرزوئیں پوری کرنیکے لئے مجھے تمہارے پہلو میں بھیجا ہے"

پرتاپ چندر - برجن ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو - کیا تمکو نہیں معلوم کہ میرا تم سے ہمیشہ پاک تعلق رہا ہے"

برج رانی "پیارے - ان خیالوں سے میرے ابھاگے دل کو تسکین نہیں ہوتی - پریم کی آگ نے ان سب خیالات کو جلا کر خاک کر دیا ہے - مینے خیال کیا تھا کہ تم نظروں سے دور ہو جاؤگے تو دل تمھیں بھلا دیگا - میں نے دل کو بہت سمجھایا - مدتوں تک شعر و سخن سے جی بہلاتی رہی - تم آج بھی لوگوں کو میرے کلام کا مداح پاؤگے - مینے شہرت اور عزت اور دولت سب پائی - اور سب سے جی سیر ہو گیا - مگر تمہاری محبت کا نقش دل سے نہ مٹا - دوسرا جنم لیکر بھی اسی آرزو میں گھلتی رہی - میں برسوں سے یہی سوچ رہی ہوں کہ تمھیں اپنی داستان غم سناؤں یا نہ سناؤں - کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر محبت میں روحانی طاقت ہے تو ہم اور تم ضرور ملیں گے - کبھی سوچتی کہ تم مجھے بھول گئے ہوگے - مگر دل کو کسی طرح نہ سمجھا سکی - آج مجبور ہو کر مینے [illegible] طاق پر رکھا اور تمہارے سامنے کھڑی ہوں - تم میرے لئے جو فیصلہ مناسب سمجھو [illegible] ہوں - خواہ مجھے اپنے پہلو میں جگہ دو - خواہ خیال میں بھی نہ لاؤ - میں تمہاری [illegible]

ساتھ سب کچھ سہنے کے لئے تیار ہوں۔ میرے پتا اس لوک کے راجہ ہیں۔ میرے سوا اُنکے کوئی اولاد نہیں۔ مگر میں سب تیاگ دونگی۔ میں تمہارے ساتھ فاقے کرونگی۔ کوئیں سے پانی کھینچونگی۔۔۔۔۔"

یہہ کہتے کہتے برجن کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ اور گلا رونده گیا۔

پرتاپ چندر عجیب مخمصے میں مبتلا تھا۔ برجن نے اُسکی محبت کا راگ گایا تھا۔ اور یہہ راگ سُنکر ایسا کون مرد ہے جو مدہوش نہو جائے۔ وہ ذرا دیر کے لئے بالکل بے کیف ہوگیا۔ سوچنے لگا آہ! کیسی سچی محبت ہے۔ کیسی غیر فانی کیسی پاکیزہ۔ کیسی بے غرض! برجن تو سچ مچ دیوی ہے۔ تب انسانوں کی دیوی تھی۔ اب دیوتاؤں کی دیوی ہے۔ تو میرے لئے یہہ بہشت اور یہہ دولت اور یہہ سُکھ تیاگ دیگی! میں کیسے تیری اس محبت کی داد دوں۔ میں تجھے کیسے بتلا دوں کہ میں ان قربانیوں کے لائق نہیں ہوں۔

پرتاپ چندر انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ اتنے میں برجن نے نزاکت سے اُسکا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "پیارے۔ میں نے تمپر فیصلہ تو چھوڑ دیا مگر دل کانپ رہا ہے کہ کہیں بے انصافی نہ کر بیٹھو۔ (ہاتھ جوڑکر) ایسا نکرنا! نہیں تمہاری برجن مرجائگی۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ میں تم سے محبت نہیں مانگتی۔ میں تمہارا دل نہیں مانگتی۔ میں تم سے صرف تمہارے ساتھ رہنے کی۔ تمہاری خدمت کرنیکی اجازت چاہتی ہوں۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں مانگتی۔ تمہارا دل میرے مان کا نہیں۔ اُسے لینے کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میری محبت پُرغرض ہے۔ حُسن وشباب چندروزہ۔ دولت فانی۔ تمہاری محبت غیر محدود ہے۔۔۔۔۔"

پرتاپ چندر کے جی میں آیا کہ اسر۔۔

جواب نددیگا۔ برجن کی روحانی عظمت نے اُسے بالکل پست کر دیا۔ قریب تھا کہ وہ اس خود فراموشی کے عالم میں اپنا برت بھول جاے۔ کہ یکایک سوامی برہمانند جی کا یہہ قول اُسے یاد آگیا "ہر نیک اور اعلیٰ کام کے راستے میں بڑے بڑے سخت امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ وہی پورا مرد ہے جو ان امتحانات سے بے داغ نکل جاے۔ بسا اوقات یہہ امتحانات رنگ و روپ بدلکر آتے ہیں۔ اسوقت ان سے مقابلہ کرنا اور بھی دشوار ہوجاتا ہے" اس قول کے یاد آتے ہی پرتاپ کا خیال کہیں سے کہیں جا پہونچا۔ ضرور میں اسوقت امتحان میں پڑا ہوا ہوں۔ وہی طاقت جو مجھے یوں پرکھ رہی ہے۔ برجن کے زبان و دل پر بھی اپنا جادو چلا رہی ہے۔ یہہ خیال کرتے ہوئے اُسنے جواب دیا۔ "برجن۔ مجھ میں یہہ بیان کرنے کی طاقت نہیں کہ اسوقت تم سے ملکر طبیعت کیسی خوش ہوئی۔ مجھے فخر ہے کہ تم جیسی پاکیزہ اوصاف دیوی مجھسے محبت رکھتی ہے۔ اس محبت کے مقابلہ میں میرے ہستی کی کچھ وقعت نہیں۔ کاش میں اس قابل ہوتا کہ اس اتھاہ پریم کی کچھ قدر کرسکتا۔ مجھ جیسا مٹی کا انسان تمہارے لائق نہیں۔ میں تمہاری پرستش کرسکتا ہوں۔ مگر محبت نہیں۔ میں تمہارے قدموں کی خاک پیشانی پر مل سکتا ہوں۔ مگر تمہاری پاکیزہ محبت کو اپنی بشریت سے آلودہ نہیں کرسکتا۔"

برجرانی کی آنکھوں سے آنسو کا دریا بہہ نکلا۔ ذرا دیر کے بعد بولی "تمہارا فیصلہ مجھے بسر و چشم منظور ہے۔ ایشور تمھیں سرسبز کرے۔ یہی میری دعا ہے۔ میرے لئے یہی خوشی کافی ہے کہ میری عزت اور محبت تمہارے دل میں موجود ہے۔ پرتاپ یقین سے اپنی خودغرضی پر نادم ہوں۔ محبت انسان کو خودغرض بنا دیتی۔ میں تمہاری محبت کی طالب نہ تھی۔ میری یہہ خواہش

نہ تھی کہ تمہاری محبت سے بہار زندگی لوٹوں۔ خیر نوشتہ تقدیر سے کیا چارہ۔ میری آخری التجا یہ ہے کہ اب میری یاد اپنے دل سے نکال ڈالنا۔ ایسا نہو کہ کسی وقت میری یاد تمھیں ستائے اور رُلائے۔ ہائے! تم رو رہے ہو۔ پیارے رو ومت۔ ایشور کے لئے اپنے اوپر ایسا ظلم نہ کرو۔ ورنہ پرتاپ پچھتاؤگے۔ تمھیں تجربہ ہو جائیگا کہ قوم کی خدمت۔ اور قوم کی محبت دل کے لئے کافی غذا نہیں ہے۔ تمھیں سب کچھ ملیگا۔ مگر برجن نہ ملیگی۔ مجھے پرماتما نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ اُسے کیا جواب دوگے؟"

پرتاپ نے روتے ہوئے جواب دیا "برجن میری پرتگیا مت توڑو۔ تمہارے روبرو یوں کھڑا رہکر میں اپنے برت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ مجھے اب رخصت کرو۔ میں جب تک زندہ رہونگا تمہاری پرستش کرتا رہونگا۔ تمہاری یاد میرے دل سے نہیں نکل سکتی"

یہہ کہتے کہتے وفور اشک سے اُسکی زبان بند ہو گئی۔ جب گھی خوب کھول جاتا ہے تو اُسکا بولنا بند ہو جاتا ہے۔ برجن نے سر جھکا کر اُسے پرنام کیا۔ اور نظروں سے غائب ہو گئی۔

شام کا وقت تھا۔ ہماچل سر پر سُنہرا تاج رکھے کھڑا تھا۔ چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں۔ آسمان پر سے دو ایک شوخ نظر تارے گھورنے لگے تھے۔ پرتاپ چندر نے دیکھا کہ برجن گیان سرور کے نیلگوں پانی میں کھڑی ہے۔ گویا جل دیوی اپنے سنگھاسن پر رونق افروز ہے۔ اور ایسی آواز سے جیسیں کوئل کی کوک۔ پپیہے کی ہوک اور شیاما کی چہک ملی ہوئی ہے۔ یہہ دلسوز نغمہ الاپ رہی ہے۔

بن ھری کیوں راکھیں من دھیر
گھر آنگن نہ سُہات رین دن۔ برسے بھوجن نیر

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

مچھلیاں روتی تھیں - اور پیڑ پتے سر دُھنتے تھے - برجن کمر تک پانی میں چلی گئی اور پھر یہہ آواز آئی -

پُن پُن وہی سُرت آوت - چت چتوت جمنا تیر

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

برجن نے پرتاپ چندر کی طرف دیکھکر ہاتھ جوڑے - پھر گلے تک پانی میں چلی گئی - ایک کمل کھِل گیا - یہہ آواز آئی -

مت ایجس آنہو ہیرا اپنے - کٹھن مدن کی پیر

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

چند تارے کان لگائے سُن رہے تھے - آسمان کی سُرخی مٹ چکی تھی - برجن نے پرتاپ چندر کو پرنام کیا - اور پانی میں غوطہ لگایا - پورنماشی کا چاند دیکھتے دیکھتے ڈوب گیا - پرتاب دوڑا - مگر پیر لڑکھڑا گئے - اور بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا +

-->ﷺ<--

چھبیسویں فصل

گنگا جمنا کا ملاپ

—— * ——

ہمارے ناظرین مادھوی کے نام سے غیر مانوس نہ ہونگے۔ جسطرح ایک سنگریزہ کسی پُرفن کاریگر کے ہاتھوں میں پڑکر موتیوں کے تول بکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح برج رانی نے مادھوی کو سکھا پڑھا کر اپنا ہی سا بنا لیا تھا۔ اُسکی خلقی نیک مزاجی اور شرافت کی دو ایک مثالیں برجن کے اُن خطوط میں ملتی ہیں جو اُسنے مجگاؤں سے کملا چرن مرحوم کے نام لکھے تھے۔ کبھی کبھی جنگلی پھولوں میں وہ بوباس اور رنگ روپ مل جاتا ہے۔ جو سجی ہوئی روشوں اور مرصع کیاریوں کو کبھی میسر نہیں ہو سکتا۔ مادھوی تھی تو ایک غریب جاہل۔ برہمن کی لڑکی۔ مگر فطرت نے اُسے جنس حُسنہ کے کل پاکیزہ اوصاف عطا کئے تھے۔ اور اُسمیں تعلیم اور تربیت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ مادھوی اور برجن کا ملاپ اُسوقت ہوا جب برجن سسرال آئی ساس بھولی بھالی لڑکی نے اسیوقت سے برجن کے ساتھ غیر معمولی محبت ظاہر کرنا شروع کی معلوم نہیں اُسے دیوی سمجھتی تھی۔ یا کیا۔ مگر کبھی اُسنے برجن کے مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکالا۔ برجن بھی اُسے اپنے ساتھ سُلاتی۔ کھلاتی۔ اور اچھے اچھے ریشمی کپڑے پہناتی۔ اِس سے زیادہ محبت وہ اپنی چھوٹی بہن کی بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دل کو دل سے لگاؤ ہوتا ہے۔ برجن کو سسرال میں آنے کے بہت پہلے ہی

معلوم ہوگیا تھا کہ میں ہی پرتاپ چندر کے خوابوں کی پری ہوں۔ اُسکی ایک ایک نظر میں۔ ایک ایک بات میں وہ اپنی محبت کی جھلک دیکھتی۔ اور افسوس کرتی۔ ایک روز جبکہ وہ کملا چرن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اُسے یہہ خیال کرکے رونا آیا تھا۔ کہ میری تو یوں لطف سے گذرتی ہے۔ اور بیچارے پرتاپ کے دل پر نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی۔ مادھوی اسوقت گیارھویں سال میں تھی۔ اور اُسکے رنگ و روپ کا نکھار۔ سلیقہ۔ گفتگو اور گن دیکھ دیکھکر سب کو حیرت ہوتی تھی۔ برجن کو معاً خیال آیا کیا میری مادھوی اس قابل نہیں کہ پرتاپ اُسے اپنے گلے کا ہار بنائیں۔ اُس دن سے وہ مادھوی کی تربیت اور خاطرداری میں اور بھی زیادہ منہمک ہوگئی۔ وہ سوچ سوچ کر دل میں پھولی نہ سماتی کہ جب مینا سولہ سترہ سال کی ہوجائیگی اُسوقت میں پرتاپ کے پاس جاؤنگی۔ اور اُس سے ہاتھ جوڑکر کہونگی کہ مادھوی میری بہن ہے۔ اسے آج سے تم اپنی چیری سمجھو۔ کیا پرتاپ میری بات ٹالدینگے؟ نہیں ایسا وہ نہیں کرسکتے۔ مزہ تو جب ہے کہ چچی خود مادھوی کو اپنی بہو بنانے کی مجھ سے التدعا کریں۔ اسی خیال سے برجن نے پرتاپ چندر کے اوصاف حمیدہ کا نقش مادھوی کے دل میں جمانا شروع کردیا تھا تاکہ اُسکا رواں رواں پرتاپ کی محبت میں سرشار ہوجاوے۔ وہ جب پرتاپ چندر کا بکھان کرنے لگتی تو خود بخود اُسکے الفاظ غیر معمولی طور پر شیریں اور فصیح ہوجاتے۔ رفتہ رفتہ مادھوی کا بچہ دل چاشنی اُلفت کے مزے لینے لگا۔ آئینہ میں بال پڑگیا۔

بھولی مادھوی سوچنے لگی میں کیسی خوش قسمت ہوں۔ مجھے ایسا سوامی ملیگا جسکا پیر دھونے کے لائق بھی میں نہیں ہوں۔ مگر کیا وہ مجھے اپنی چیری بنائینگے۔ کچھ ہو میں ضرور اُنکی رانی بنونگی۔ اور پریم میں کچھ جادو ہے تو میں اُنھیں ضرور اپنا بنالونگی۔ مگر اُس غریب کو

پریم چند کی تصانیف [illegible]

کیا معلوم تھا کہ یہہ آرزوئیں حسرت بنکر آنکھوں کے راستہ بہہ جائینگی۔ اُسکا پندرھواں سال پورا بھی نہوا تھا کہ برجن پر خانہ تباہی کے صدمے آپڑے۔ اُس طوفان کے جھونکے نے مادھوی کے اس خیالی پھلواڑی کا ستیاناس کردیا۔ اسی اثنا میں پرتاپ چندر کے لاپتہ ہونے کی خبر ملی۔ طوفان نے جو کسر رکھ چھوڑی تھی وہ اس آگ نے جلا کر راکھ کردی۔

مگر خیال کوئی چیز ہے تو مادھوی خیال میں پرتاپ چندر کی بیوی بن چکی۔ اُسنے اپنا تن اور من اُنھیں سونپ دیا۔ پرتاپ کو خبر نہیں۔ مگر آج اُسے ایسی بیش بہا چیز ملی ہے جسکے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ مادھوی نے صرف ایکبار پرتاپ کو دیکھا تھا۔ اور صرف ایکبار اُسکی امرت کی سی باتیں سنیں تھیں۔ مگر برجن کی شیریں بیانیوں نے اُسکے سینہ میں آگ کی وہ چنگاری ڈالدی تھی جو روئی کے تودے میں گھسکر اُسے جلاکر خاکستر کردیتی ہے۔ پرتاپ کا پتہ نہیں ہے۔ مگر مادھوی اُسکی سوز محبت میں روز بروز گھلتی جاتی ہے۔ اُس دن سے کوئی ایسا برت نہیں تھا جو مادھوی نرکھتی ہو۔ کوئی ایسا دیوتا نہیں تھا جسکی وہ پوجا نہ کرتی ہو۔ اور یہہ سب اس لئے کہ ایشور پرتاپ کو جہاں کہیں ہو۔ خیریت سے رکھے ان خیالات نے اُس لڑکی کو اور بھی زیادہ متین۔ نیکمزاج اور شریف بنا دیا۔ شائد اُس کے دل نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میرا بیاہ پرتاپ چندر سے ہوچکا۔ برجن اُسکی یہہ حالت دیکھتی۔ اور روتی کہ یہہ آگ میری ہی لگائی ہوئی ہے۔ اب یہہ گل نورس کسکے گلے کا ہار بنے گا۔ وہ کسکی ہوکر رہیگی۔ ہائے! جس بیج کو میںنے اتنی محنتوں سے اُگایا۔ اور شہد اور دودھ سے سینچا۔ اُسکا پھول اسطرح شاخ پر کمھلایا جاتا ہے! برجن تو خیر شعر و سخن میں اُلجھی رہتی۔ یہی باغیچہ اُسکا ہمدم اور پودھے اُسکے مونس تھے۔ مگر مادھوی کو یہہ مشغلہ کہاں۔ اُسکا مونس اور ہمدم صرف خیال یار تھا۔ اُس یار کا جو ابتک اُسکے لیے بیگانہ محض تھا۔ ایک روز پرتاپ کے

چلے جانے کے بعد مادھوی نے خواب دیکھا کہ وہ سنیاسی ہو گیا ہے۔ آج مادھوی کا اتھاہ پریم ظاہر ہوا۔ اُسے الہام سا ہو گیا کہ پرتاپ نے ضرور سنیاس لے لیا۔ آج سے وہ بھی تپسونی بن گئی۔ ذاتی آرام و آسایش کا خیال دل سے جاتا رہا۔

جب کبھی بیٹھے بیٹھے مادھوی کا جی بہت گھبراتا تو وہ پرتاپ چندر کے گھر جا بیٹھتی۔ وہاں اُسکے دل کو ذرا دیر کے لیے تسکین ہو جاتی تھی۔ جب سے سُبا ما کو برجن کے خطوط کا بیاض ملا تھا۔ اُسکی زندگی نے عجیب روش اختیار کر لی تھی۔ غرور حُسن اُسکے اوصاف کا رُکن خاص تھا۔ اُسنے اپنی پیشانی پر بل تک نہ آنے دیا۔ زبان سے افسوس و ملال کا ایک لفظ بھی نہ نکلنے دیا۔ نہ آنکھوں سے حسرت کے آنسو بہنے پائے۔ حسب معمول ٹھیکہ کا کاروبار کرتی رہی۔ بلکہ اب اور بھی مصروفیت و انہماک کے ساتھ۔ ہاں اب بجائے بخیلانہ کفایت شعاری کے مزاج میں فراخدلی آگئی تھی۔ یہ مکان مادھوی کے لئے ایک پاک مندر تھا۔ جب تک برجن اور سُبا ما کے دلوں میں گانٹھ پڑی ہوئی تھی وہ یہاں بہت کم آتی تھی۔ مگر جب آخر کار برجن کی پاکیزہ شاعری۔ پاکیزہ خیالات اور پاکیزہ طرز زندگی نے دونوں عورتوں کے دلوں کی گانٹھ کھولدی اور وہ گنگا جمنا کی طرح باہم گلے ملگئیں تو مادھوی کی آمد و رفت بھی بڑھی۔ سُبا ما کے پاس دن کے دن بیٹھی رہ جاتی۔ اس گھر کی ایک ایک اُنگل زمین پرتاپ چندر کی یادگار تھی۔ اسی آنگن میں بالاجی نے کاٹھ کے گھوڑے دوڑائے تھے۔ اور اسی حوض میں کاغذ کی ناویں چلائی تھیں۔ ناویں تو شاید زمانہ کے بھنور میں پڑ کر ڈوب گئیں۔ مگر گھوڑا اب بھی موجود تھا۔ مینا نے اُسکی بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈالدی اور اُسے باغیچہ میں حوض کے کنارے ایک گلاب کے سایہ میں باندھ دیا۔ یہی کمرہ بالاجی کا آرامگاہ تھا۔ مادھوی اُسے اب اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی ہے۔ اسی پلنگ نے بالاجی کو مدتوں تک

اپنے آغوش میں تھپک تھپک کر سُلایا تھا۔ مادھوی اب اُسے پھولوں سے سجاتی ہے کیا پلنگ
نے ایسے دن بھی کبھی دیکھے تھے۔ مادھوی نے اس کمرہ کو ایسا آراستہ کر دیا جیسا وہ
کبھی نہ تھا۔ تصویروں کے چہرہ پر سے گرد کا نقاب اُٹھ گیا۔ لیمپ کے نصیب پھر روشن
ہوئے۔ مادھوی کی اس ہمہ گیر محبت سے سُباما کا کفر بھی ٹوٹ گیا۔ مدت سے اُسکی زبان
پر پرتاپ چندر کا نام کبھی نہیں آیا تھا۔ برجن سے میل جول بھی ہو گیا مگر دونوں عورتوں
میں کبھی پرتاپ کا ذکر نہیں آیا۔ حیا برجن کی دامنگیر تھی۔ اور خودداری سباما کی۔ مگر مادھوی
کے شعلہ محبت نے پتھر کو بھی پگھلا دیا۔ جب وہ ایک از خود رفتگی کے عالم میں پرتاپ کے
بچپنے کی باتیں پوچھنے لگتی تو سُباما سے ضبط نہ ہوتا۔ اُسکی آنکھیں بھر آئیں۔ تب دو کی دونوں
روتیں۔ اور دن دن بھر اُنکی باتیں ختم نہ ہوتیں۔ کیا اب بھی مادھوی کا حال دل سُباما سے
چھپ سکتا تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ کیا یہ تپسونیوں ہی محبت کی آگ میں جلتی رہیگی۔ اور بلا کسی
اُمید کے!

آٹھ نو سال بیت گئے۔ ایک روز برج رانی نے کملا کا پیکٹ کھولا تو سرورق پر ایک
نہایت پُر جلال تصویر۔ کئی رنگوں میں بنی ہوئی نظر آئی۔ یہ کسی مہاتما کی تصویر تھی۔ اُسے
خیال آیا کہ مینے اِن مہاتما کو کہیں ضرور دیکھا ہے۔ سوچتے سوچتے یکایک اُسکا خیال پرتاپ چندر
تک جا پہونچا۔ فرط مُسرت سے اُچھل پڑی۔ اور بولی "مادھوی۔ ذرا یہاں آ جا"

مادھوی پھولوں کی کیاریاں سینچ رہی تھی۔ اُسکے دل بہلاؤ کا آجکل یہی مشغلہ تھا۔
ساڑی پانی میں لت پت۔ سر کے بال بکھرے۔ ماتھے پر پسینہ کی بوندیں۔ آنکھوں میں
پریم کا رس۔ آکر کھڑی ہو گئی۔ برجن نے کہا "آ تجھے ایک تصویر دکھاؤں"

مادھوی "کسکی تصویر ہے۔ دیکھوں"

مادھوی نے تصویر کو بغور دیکھا۔ اور آبدیدہ ہوگئی۔

برجن "پہچان گئی"!

مادھوی "کیوں؟ یہہ شکل میں کئی بار خواب میں دیکھ چکی ہوں۔ چہرہ سے تیج برس رہا ہے"

برجن "دیکھو کچھ حالات بھی لکھے ہیں"

مادھوی نے دوسرا ورق اُلٹا تو "سوامی بالاجی" کی سُرخی نظر آئی۔

تھوڑی دیر تک دو کی دونوں۔ خاموش۔ محویت کی تصویر بنی ہوئی۔ یہہ مضمون پڑھتی رہیں۔ بعدازاں بات چیت ہونے لگی۔

برجن "میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ انھوں نے ضرور سنیاس لے لیا ہوگا"!

مادھوی زمین کی طرف تاک رہی تھی۔ مُنہ سے کچھ نہ بولی۔

برجن "تب میں اور اب میں کتنا فرق ہے؟ چہرہ سے جلال برس رہا ہے۔ تب ایسے وجیہ نہ تھے"

مادھوی "ہوں۔۔۔"

برجن "ایشور اُنکی مدد کرے۔ بڑی تپسیا کی ہے۔ (آبدیدہ ہوکر) کیا اتفاقات ہیں۔ ہم اور وہ ساتھ ساتھ کھیلے۔ ساتھ ساتھ رہے۔ آج وہ سنیاسی ہیں۔ اور میں بروگن۔ نہ جانے اُنھیں ہم لوگوں کی کچھ سُدھ بھی ہے یا نہیں۔ جسنے سنیاس لے لیا اُسے کسی سے کیا ناتا۔ جب چچی کے پاس ایک خط نہ لکھا تو بھلا ہماری یاد کیا باقی ہوگی۔ مادھوی! بچپنے میں وہ کبھی جوگی جوگی کھیلتے تو میں مٹھائیوں کی بھکشا دیا کرتی تھی"۔

مادھوی نے رو کر کہا "نہ جانے کب درشن ہونگے" یہہ کہکر شرم سے سر جھکا لیا۔

برجبن ۔ آئینگے جلد۔ راجہ دھرم سنگھ اور بھیّا دونوں اُنھیں ضرور لائینگے ۔"

مادھوی ۔"اِن دونوں آدمیوں نے بھی بڑے حوصلے کا کام کیا۔"

برجبن ۔"کیسا کچھ! راجہ صاحب یہاں سے سیر کرنے گئے تھے ۔شاید خطاب کی آرزو کھینچ لے گئی تھی ۔ اُنکی جائداد دو ڈھائی کروڑ سے کم کی نہیں ۔ پچاس لاکھ تو سالانہ نفع ہے۔ اُنکا اس فراخدلی سے ساری جائداد کارِخیر میں وقف کر دینا ۔ اور اسکے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی ارپن کر دینا بڑا بھاری تیاگ ہے۔ بھیّا نے بھی کُل کا نام روشن کر دیا۔ مجھے اُنکی طرف سے ایسی اُمید نہ تھی۔"

مادھوی ۔" چندرا بہن آتی ہونگی۔"

برجبن ۔" ہاں اب وہاں کیا کرینگی ۔اُنھیں بھیّا کا یہہ کام شاید ہی پسند آیا ہو۔ جھلاتی ہوئی آتی ہونگی۔"

مادھوی ۔" درشنوں کو لوگ بہت دور دور سے آئے تھے۔"

برجبن ۔" تقریر کی کیسی تعریف کی ہے ۔ اُنکی زبان میں تو پہلے ہی جادو تھا ۔ اب کیا پوچھنا۔ بھیّا کے دل پر جسکی تقریر کا ایسا اثر ہوا وہ ساری دنیا پر اپنا جادو پھیلا سکتا ہے۔"

مادھوی ۔"چلو چچی کے یہاں چلیں۔"

برجبن ۔"ہاں اُنکا تو خیال ہی نہیں رہا ۔ دیکھیں کیا کہتی ہیں۔ خوش تو کیا ہونگی۔"

مادھوی ۔" اُنکی تو ابھلا کھا ہی یہہ تھی ۔ خوش کیوں نہونگی۔"

برجبن ۔" چل ۔ ماں یہہ خبر سُنکر کبھی نہیں خوش ہو سکتی۔"

دونوں عورتیں گھر سے باہر نکلیں ۔ دونوں حُسن کی رانی تھیں ۔ برجبن کو دیکھکر اکثر آدمی سرِتعظیم خم کرتے تھے ۔ لوگ فرطِ ادب سے اُسکے سامنے سے ہٹ جاتے ۔ خاص و عام

میں اُسکی یکساں عزت تھی۔

کوئی مادھوی سے پوچھے تیرے پیر اب زمین پر کیوں نہیں پڑتے۔ تیرے زرد چہرے پر کیوں مسرت کی سُرخی جھلکا کرتی ہے۔ تجھے کونسی دولت مل گئی۔ تو اب متفکر و مغموم نہیں نظر آتی۔ تجھے اپنے پریتم سے ملنے کی اب کوئی اُمید نہیں۔ تجھ پر محبت کی نگاہیں کبھی نہیں پڑیں۔ تیرے کانوں میں محبت کی آوازیں کبھی نہیں پہونچیں۔ پھر تو کیوں پھولی نہیں سماتی۔ اسکا جواب مادھوی کیا دیگی۔ کچھ نہیں۔ وہ سر جھکالیگی۔ اُسکی آنکھیں نیچے جُھک جائینگی۔ جیسے ڈالیاں پھولوں کے بوجھ سے جُھک جاتی ہیں۔ اور شاید آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑیں۔ مگر اُسکی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلیگا۔

مادھوی محبت کے نشہ سے متوالی ہے۔ اُسکا دل دیوانہ محبت ہے۔ اُسکی محبت بازار کا سودا نہیں۔ اُسکا پریم کسی چیز کا بھوکا نہیں۔ وہ محبت کے عوض محبت نہیں چاہتی۔ اُسے ناز ہے کہ ایسے پاک منش آدمی کی صورت میرے دل میں جلوہ گزیں ہے۔ اور یہی اُسکی دیوانگی۔ اُسکے پریم اُسکے عشق کا صلہ ہے۔

دوسرے مہینہ میں برج رانی نے بالاجی کے خیر مقدم میں ایک پُر زور نظم لکھی۔ یہہ ایک شاعرانہ معجزہ تھا۔ جب یہہ نظم شائع ہوئی تو علمی دنیا باوجود برجن کی روزافزوں بلند پروازیوں سے مانوس ہونے کے حیرت میں آگئی۔ وہ طائر فکر جو شاعری کے آسمان میں کُرہ ہوا سے بھی آگے نکل جاتا ابکی تارا بنکر چمکا۔ ایک ایک شعر الہامی روشنی سے منور تھا۔ جن لوگوں نے وہ نظم پڑھی بالاجی کے فدائی ہو گئے۔ شاعر وہ شعبدہ باز ہے جسکی پٹاری میں بجائے سانپوں کے دل بند ہوتے ہیں۔

ستائیسویں فصل

تاریخ کا ایک ورق

ناظرین۔ بالاجی کے قومی کارنامے آپ کو تاریخ کے صفحوں میں آب زر سے لکھے ہوئے ملیں گے۔ ہم نے ان صفحات میں اُن حالات اور واقعات کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے جو اس کارنامے کے محرک ہوئے کسی گری ہوئی قوم کو اُبھارنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر اُسکا صلہ بھی ساری دنیا کی دولت سے زیادہ گراں بہا اور بیش قدر ہوتا ہے۔ بالاجی کے نام پر آج مورخ کا قلم وجد کرنے لگتا ہے۔ شعرا اُسکے نام پر بلند پروازیوں کے موتی نثار کرتے ہیں۔ ملک کے در و دیوار اُسکا جس گا رہے ہیں۔ اُسکا ذکر آتے ہی لوگوں کے سر تعظیم سے جھک جاتے ہیں۔ اور دل قومی جوش سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

کسی گری ہوئی قوم کو اُبھارنا آسان کام نہیں۔ مگر اُسکا صلہ جنت کی نعمتوں سے بھی زیادہ حیات بخش ہوتا ہے۔ بچے ماں کی گود میں بالاجی کے کارنامے سنتے ہیں۔ اُسکی یاد دلوں میں حوصلہ اور بازوؤں میں قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اُسکے نام سے بستیاں بس رہی ہیں۔ اور عدسگاہیں کھل رہی ہیں۔ اُسکے نام پر زبانیں فصاحت کے پھول چڑھاتی ہیں۔ اُمرا اپنے محلوں میں۔ اور غربا اپنے جھونپڑوں میں اُسکے گن گاتے ہیں۔ اُس کی صورت آنکھوں سے نہیں اُترتی۔ اُسکی پُر زور اور پُر حوصلہ آواز ابتک کانوں میں گونج رہی ہے۔ اُسکے خیالات آنیوالی نسلوں کے دماغوں کو سنوارینگے

اور صدیوں تک اُسکے ہموطنوں کے لئے گنبد نور کا کام دینگے۔

دیکھئے ایک بے یار و مددگار شخص قوم کو اُبھارنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے۔
اس کام کے راستہ میں دولت کی اور مددگاروں کی کمی حائل نہیں ہو سکتی۔روحانی قوت۔
درد مند دل۔ وسیع ہمدردیاں۔ یہہ ضروری سامان ہیں۔ ابھی بہت دن نہیں گذرے
کہ پرتاپ چندر ایک گمنام آدمی تھا۔ آج اُسکا نام بچے بچے کی زبان پر ہے۔ کیا اُسکے پاس
قارون کا خزانہ تھا! پنگھٹ پر جب عورتیں کولھوں پر گھڑے رکھے پانی کے لئے آتی ہیں
تب بالاجی ہی کے چرچے ہوتے ہیں۔ اور اُنھیں کے جس گائے جاتے ہیں۔ اناج کے
کھیتوں میں اُنھیں کی بڑائی ہوتی ہے۔ یہی قومی خدمتگذار کا انعام ہے۔ کلکتہ میں جب وہ
گئے تو پھولوں کی برکھا ہوئی۔ ہزاروں من پھول پیروں تلے روند ڈالے گئے۔ اُس دن
مندروں میں دیوتاؤں کو پھولوں کی باس نہ ملی۔ رنگین مزاجوں کے گلے میں پھولوں کے
گجرے نہ دکھائی دیتے۔ اور حسینوں کی سیجیں پھولوں سے نہ سجائی جا سکیں۔ مگر بالاجی کو
اس نمایش اور دھوم دھام سے مطلق دلچسپی نہ ہوئی۔ دوسرے دن جب وہ بھاگیرتی کے
کنارے۔ پانی میں غروب آفتاب کی بہار دیکھ رہے تھے تو کئی عورتیں پانی بھرنے آئیں۔
اور گھڑوں کو پانی میں گھما گھما کر باتیں کرنے لگیں۔

ایک نے کہا "بہن تو نے سُنا نہیں۔ بالاجی آئے ہیں"

دوسری بولی۔" ہمارے ایسے بھاگ کہاں کہ اُنکے درشن ملیں"

تیسری بولی" تو چلنے پر راضی ہو تو میں تیرے ساتھ چلوں۔ وہ آج اپنا گوشالہ
دیکھنے آئینگے۔ کون دور ہے مجھے گؤوں کے لئے کھلی اور دانہ بھی لیجانا ہے۔ ایک پنتھ
دو کاج ہو جائے گا"

چوتھی بولی" ایسے دیوتا کے درشن نکینگی تو بڑا پاپ ہوگا۔ دیکھ جب سے اُن کا گوشالہ کھلا ہے لڑکوں کو دونوں وقت دودھ پینے کو مل جاتا ہے۔ نہیں تو روکھی روٹیوں کو ترستے تھے"

بالاجی نے یہہ باتیں سنیں۔ اور بھاگیرتھی کے گلنار پانی کی طرح چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اُنھوں نے گاؤں گاؤں گوشالے کھلوا دیئے تھے۔ اُنکا سِدھانت تھا کہ ہماری قومی تباہی اور زوال کا اصلی سبب ہمارا جسمانی ضعف اور ذاتوں کی بیجا تفریق ہے۔ جب ہمارے بچّے روکھی روٹیوں کو ترستے ہیں۔ اور دودھ گھی کی خوشبو بھی اُنکے ناک تک نہیں پہونچنے پاتی تو کوئی تعجب نہیں کہ اُنکے قواے ایسے ضعیف۔ چہرے ایسے پژمردہ اور اعضا ایسے کمزور ہیں۔ بلند ارادے اور اونچے خیالات چوڑے سینوں اور مضبوط کلائیوں میں رہا کرتے ہیں۔ جب قواے جسمانی کا یہہ حال ہے تو خیالات کیسے اونچے اُڑیں۔ استقلال کہاں سے آئے۔ جُرأت کہاں سے پیدا ہو۔ پھول کیسے کھلیں جب جڑ کو غذا نہیں پہونچتی۔ پھل کہاں سے آئیں جب پیڑ سوکھا جاتا ہے۔ زمین کو تر کردو۔ اُسمیں پانس ڈالدو۔ پھر دیکھو کیسے خوشنما اور خوشبودار پھول کھلتے ہیں۔ اور کیسے لذیذ اور رسیلے پھل لگتے ہیں۔ جسمانی ضعف سے زیادہ مہیب قومی دشمن وہ شرمناک حقارت ہے جس سے ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے ہیں۔ ہم نے نیچی اور اونچی ذاتیں مقرر کر رکھی ہیں۔ اور فطرت کے اس زبردست قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ کہ خلقت بتدریج ترقی کرتی ہوئی اعلیٰ تر مدارج پر پہونچتی ہے۔ آج تک جتنے رشی اور مہاتما ہو گذرے ہیں اُن سبھوں نے آریہ ورت سے اس تفریق کے مٹانے کی کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بُدھ وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے ہندوں کی پیشانی پر سے اس بے انصافی اور ظلم کا داغ مٹانا چاہا۔ اور اُنھیں بہت کچھ کامیابی ہوئی۔ اُنکے بعد

سری شنکر۔ سری رامانج ۔ سری چیتن ۔ سری رام کرشن سری سوامی ویاتند اور سوامی رام تیرتھ سبھی مہاتماؤں نے یہی تعلیم دی کہ اپنے بھائیوں کو اپنا بھائی سمجھو۔ جاہل بھائی بھی تمہارا بھائی ہے ۔ اور نادار بھائی بھی تمہارا بھائی ہے۔ اُسے حقیر مت سمجھو۔ تمہاری نجات اتفاق سے ہوگی۔ تفریق سے نہیں۔ جو شخص اپنے ہموطنوں پر حقارت کی نگاہ ڈالتا ہے وہ کبھی ترقی کے زینہ پر نہیں پہونچ سکتا۔ پیارو! جب تک ایک چمار کے سامنے برہمن سر تعظیم جھکانا نہ سیکھیگا اسوقت تک قوم کی ناو ہرگز نہ پار لگیگی۔ یقین مانو۔ تمہاری ناو جگہ سے ایک انگل بھی نہ ہلیگی۔ تمہارے ڈانڈے ٹوٹ جائینگے۔ تمہارے بادبان پھٹ جائینگے۔ اور تمہارے ملاح ہانپ ہانپ کر بیدم ہو جائینگے۔

یہہ بالاجی کے خیالات ہیں۔ افسوس ہے کہ اُنکی زندگی نے وفا کی۔ ورنہ وہ ہندوستان کے لئے کیا کچھ نہ کر جاتے۔ تاہم جو کچھ اُنھوں نے کیا اُسپر ہر ایک ہندوستانی فخر کرسکتا ہے۔ ایسا کون سا گاؤں ہے جہاں بالاجی کا گوشالہ نہ قائم ہو۔ ہندوستان کی چپہ چپہ زمین کو اُنھوں نے اپنے قدموں سے روشن کیا۔ پونا۔ بمبی ۔ مدراس ۔ میسور ۔ کٹک گجرات جیسے جیسے دور دراز جگہوں میں مہینوں رہے ۔ اور اپنی بلند آواز سے سوتی ہوئی آتماؤنکو جگاتے رہے ۔ چھ ہفتہ کی کوشش میں انھوں نے صرف میسور میں کم و بیش تین ہزار گوشالے کھلوا دیئے ۔ آفتاب کی چمک سے پانی میں بھی ایسی چمک آجاتی ہے کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتیں۔ بالاجی کا جوش ۔ اور حوصلہ دوسروں کو سرگرم ۔ پُرجوش اور حوصلہ مند بنا دیتا تھا۔ جہاں جہاں بالاجی نے گوشالے قائم کئے وہاں خود بخود اکھاڑے بنگئے ہیں جنکی خوش آئند صدائیں صبح کو مبارکباد دیتی ہیں۔ اور للکار کی پُرجوش آوازیں درختوں کو نیند سے جگاتی ہیں۔

ذاتوں کی باہمی تفریق مٹانے کے لئے انھوں نے جو زبردست کوششیں کیں وہ صفحہ

تاریخ کے لئے ہمیشہ باعث ناز رہیگی - وہ مبارک گھڑی تھی جب اُنھوں نے پٹنہ میں "ارجن سبھا" کی بنیاد ڈالی - تین سال کے اندر ایسا شاید ہی کوئی شہر یا گانوں تھا جہاں ارجن سبھا کی شاخیں نہ کھلگئی ہوں - یہ انھیں ارجن سبھاؤں کی کوششوں کا پھل ہے کہ آج ہر قصبہ میں نیچی ذاتوں کے لئے جُدا جُدا مدرسے - جُدا جُدا بورڈنگ ہاوس قائم ہیں ارجن سبھا کے ممبران مدرسوں میں تعلیم دیتے ہیں - اور ان ذاتوں کے تمدن اور معاشرت کے عیوب کی اصلاح کرنے میں سرگرم ہیں یہ لوگ گانوں گانوں گھومتے ہیں - اور ہندو قوم کے مظلوموں کو بیداری کا مژدہ سُناتے ہیں - اُن سے بھائیوں کی طرح بغلگیر ہوتے ہیں - اور انکے دلوں میں خودداری کا احساس پیدا کرتے ہیں - مبارک اور جاں بخش ہوتا تھا وہ نظارہ جب بالاجی اپنے مظلوم بھائیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھکر انکا دل اور حوصلہ بڑھانے کی باتیں کرتے تھے - آج بالاجی کا نام سُنکر یہ لوگ پھولے نہیں سماتے - انلوگوں میں اخلاق و عادات کے سُدھارنے کی جو کوشش آپ دیکھتے ہیں یہ بالاجی ہی کی جانفشانیوں کا نتیجہ نیک ہے -

ہمارے قومی کاموں کا ایسا کوئی جزو نہیں ہے جو بالاجی کی عنایت کا ممنون نہو - اُنکا وقت - اُنکا دھیان - اُنکی سرگرمی اور اُنکا سب کچھ قوم کی خدمت کے لئے وقف تھا - وہ قوم کے سرتاج - اور قوم کے چاکر دونوں ہی تھے -

---

اٹھائیسویں فصل

بنارس میں آمد

جب سے شہرت نے برج رانی کو اپنا منظور نظر بنایا تھا اُسکے یہاں ہر دم عورتوں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ شہر میں مستورات کی کئی سبھائیں تھیں۔ اُنکے متعلق سارا بوجھ اُسیکو اُٹھانا پڑتا۔ اُسکے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی اکثر عورتیں اُسکے ملاقات کو آتی رہتی تھیں۔ جو تیرتھ جاترا کرنے کے لئے بنارس آتا تھا وہ برجن سے ضرور ملاقات کرتا۔ راجہ دھرم سنگھ نے اُسکے کلام کا مجموعہ بڑی آب و تاب سے شائع کیا تھا۔ اور اس مجموعہ نے اُسکی شاعرانہ سطوت کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ ہندوستان کا تو کیا شمار۔ یورپ اور امریکہ کے سر برآوردہ شعرا نے بھی اُسے اسکی محاسن کلام پر مبارکباد دی۔ ہندوستان میں شاید ہی ایسا کوئی خوش مذاق شخص ہو گا جسکے کتابوں کا طاق اس دیوان سے آراستہ نہو۔ اور برجن کے کلام کی قدر کرنیوالوں میں بالاجی کا درجہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ اپنی پُرزور تقریروں اور تحریروں میں اُسکی کلام کی سندیں دیا کرتے تھے۔ اور ایکبار سرسوتی میں اُسکی پُرزور تنقید لکھی تھی۔

ایک روز برجن صبح کے وقت بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ سیتا۔ چندر کنور۔ رکمنی اور رانی آئیں۔ چندر کنور زیوروں سے لدی ہوئی۔ سیتا متین اور خاموش رکمنی کا چہرہ پژمردہ۔ الوداع شباب کی تصویر۔ اور رانی ناک چوٹی سے درست۔ عطر میں ڈوبی ہوئی۔ چندر انے

اِن عورتوں کو فرش پر بیٹھایا۔ اور انکی خاطر مدارات کی۔ برجن نے صبح کا وقت فکر سخن کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اسوقت وہ بلاکسی خاص ضرورت کے سکھیوں سہیلیوں سے نہ ملتی جلتی تھی۔ باغچہ میں ایک خوبصورت کنج تھا۔ گلاب کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوائیں آتی تھیں۔ وہیں برجن ایک قالین پر بیٹھی ہوئی فکر سخن کیا کرتی تھی۔ اور بحر معنی سے جو موتی وہ نکالتی اُنھیں مادھوی سلک رقم میں پرو دیا کرتی۔ آج بہت دنوں کے بعد۔ اور اہل شہر کے متواتر تقاضوں پر برجن نے بالاجی کو بنارس میں آنیکی دعوت دینے کے لئے قلم اُٹھایا تھا۔ بنارس ہی وہ شہر تھا جسکی یاد کبھی کبھی بالاجی کو بے چین کر دیا کرتی تھی۔ مگر باوجود اہل بنارس کے مسلسل دعوت اور اصرار کے اُنھیں بنارس آنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ سیلون اور رنگون تک گئے۔ مگر بنارس کی طرف رُخ نہ کیا۔ اس شہر کو وہ اپنا امتحان کدہ سمجھا کرتے تھے۔ اسی لئے آج برجن انھیں بنارس آنے کی دعوت دے رہی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دعوت اُنھیں ضرور کھینچ لائیگی۔ جب کوئی تازہ خیال آجاتا ہے تو برجن کا چاند سا چہرہ چمک اُٹھتا ہے۔ اور مادھوی کے چہرہ پر سُرخی کی جھلک آجاتی ہے۔ باغچہ میں گلاب کے بہت پھول کھلے ہیں۔ رات کی شبنم میں نکھر کر وہ اسوقت بہت سُہانے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اسوقت جو تازگی اور سہاناپن ان دونوں پھولوں پر ہے اُسے دیکھ دیکھکر دوسرے پھول شرمائے جاتے ہیں۔ دونوں پھول باغ فردوس کے پھول ہیں۔

مگر نہیں۔ ہم بھولتے ہیں۔ ایسے حُسن دلاویز کو پھول سے کیا نسبت۔ پھول میں وہ دلاویزی کہاں وہ رس کہاں وہ کشش کہاں کسی نے ایسا پھول دیکھا ہے جسے دیکھنے سے کبھی آنکھیں آسودہ نہ ہوں۔ اور دیکھنے کی ہوس باقی رہے۔ ایسا پھول کہاں ہے جسے دیکھکر

دل پر ایک بجلی سی کوند جائے۔ جسکی صورت دل پر نقش ہو جائے۔ شعرا نے پھول کا رتبہ بڑھا رکھا ہے۔ پھر کیا اس حسن کو چاند سے تشبیہ دیں۔ آہ! یہاں بھی شاعروں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ چاند میں وہ دلفریبی کہاں۔ چاند میں روشنی ہے۔ چمک ہے۔ مگر حسن کہاں۔ کیا چاند بھی ایسی چیز ہے جسے دیکھنے سے جی نہ بھرے۔ کیا چاند بھی جگر کو مسوسنے لگتا ہے۔ کیا چاند کو دیکھکر بھی روح پر ایک نشہ سا ہو جاتا ہے۔ حق یہہ ہے کہ حسن کی تشبیہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں دیجا سکتی۔ کسی چیز میں یہ کشش۔ یہ اثر۔ یہہ دلاویزی نہیں۔

نو بجتے بجتے برجن کمرہ میں آئی۔ سیوتی بولی "آج بڑی دیر لگائی"

برجن "کنتی نے سورج کے بلانے کے لئے کتنی تپسیا کی تھی"

سیتا "بالاجی بڑے نٹھر ہیں۔ میں تو ایسے آدمی سے کبھی نہ بولوں"

رکمنی "جسنے سنیاس لے لیا اُسے گھربار سے کیا ناتا"

چندر کنور "یہاں آئینگے تو میں منہ پر کہدونگی کہ حضرت یہ معشوقانہ انکار کہاں سیکھا"

رکمنی "مہارانی رشی مہاتما ؤں کا تو ادب کیا کرو۔ زبان کیا ہے کتر نی ہے"

چندر کنور "اور نہیں کب تک صبر کریں جی۔ سب جگہ جاتے ہیں یہیں آتے پیر تھکتے ہیں"

برجن۔ (مسکرا کر) "اب بہت جلد درشن پاؤ گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس مہینہ میں وہ ضرور آئینگے"

سیتا "دھنیہ بھاگ کہ درشن تو ملینگے۔ میں تو جب انکا حال پڑھتی ہوں تو یہی جی چاہتا ہے کہ پا جاؤں تو پیر پکڑ کر گھنٹوں روؤں"

رکمنی "ایشور نے انکے ہاتھوں میں بڑا جس دیا ہے۔ دراننگر کی رانی صاحبہ مرہی چکی تھیں۔ یقین مانو دم ٹوٹ رہا تھا کہ بالاجی کو خبر ہوئی۔ فوراً آپہونچے۔

اور دم کی دم میں اُٹھاکر بٹھادیا۔ ہمارے منشی جی (شوہر) اُن دِنوں وہیں تھے۔
کہتے تھے کہ رانی جی نے خزانہ کی کنجی لیکر بالاجی کے پیروں پر رکھدی۔ اور کہا
آپ اسکے مالک ہیں بالاجی نے کہا مجھے خزانہ درکار نہیں۔ آپ اپنی ریاست میں
تین سو گو شالے کھلوادیجیئے۔ زبان سے نکلنے کی دیر تھی آج وارانگر میں دودھ
کی ندی بہتی ہے۔ ایسا مہاتا کون ہوگا۔

چندر کنور: "راجہ نولکھا کا تپ دق اُنھیں کی بوٹیوں سے چھوٹا۔ سارے حکیم
ڈاکٹر جواب دیچکے تھے۔ جب بالاجی چلنے لگے تو مہارانی صاحبہ نے نولاکھ
کا موتیوں کا ہار اُنکے پیروں پر رکھدیا۔ مگر اُسکی طرف دیکھا تک نہیں"

رانی: "عجیب مردہ طبیعت کے ہیں!"

رکمنی: "ہاں اور کیا۔ انھیں چاہئے تھا کہ ہار لے لیتے۔ بلکہ گلے میں ڈال لیتے"

برجن: "نہیں لیکر رانی کو پہنا دیتے۔ کیوں سکھی؟"

رانی: "ہاں میں اُس ہار کے لئے غلامی لکھدیتی"

چندر کنور: "ہمارے یہاں اتوار جن سبھا کے ممبر بن بیٹھے ہیں۔ ڈھائی سو روپیہ
لاکھ جتن کرکے رکھ چھوڑا تھا۔ اُسے اُٹھا لے گئے کہ گھوڑا لیں گے۔ کیا ارجن
والے بلا گھوڑے کے نہیں چلتے"

رانی: "کل یہہ لوگ قطار باندھکر میرے مکان کے سامنے سے جارہے تھے۔ بڑا
اچھا معلوم ہوتا تھا"

اسی اثنا میں سیوتی تازہ اخبار لائی۔

برجن: "کوئی نئی خبر ہے؟"

سیوتی :- ہاں بالاجی مانکپور آئے ہیں۔ ایک اہیر نے اپنے لڑکی کی شادی کا نویدہ بھیجا تھا۔ اسپر الٰہ آباد سے ارجن سبھا کے ممبروں کے ساتھ راتوں رات مانکپور پہونچے۔ اہیروں نے بڑے جوش سے خیر مقدم کیا ہے۔ اور ملکر پانچسو گائیں انھیں بھینٹ دی ہیں۔ بالاجی نے دُلہن کو دُعا دی۔ اور دولہا کو گلے لگایا۔ پانچ اہیر ارجن سبھا کے ممبر بنائے گئے ۔"

برجن :- "نہایت دلچسپ خبر ہے۔ مادھوی اسے کاٹ کے رکھ لینا۔ اور کچھ ؟"

سیوتی - پٹنہ کے پاسیوں نے ایک ٹھاکر دوارہ بنوایا ہے۔ پٹنہ کی ارجن سبھا نے بڑے دھوم دھام سے اُسکا جلسہ کیا ۔"

برجن :- "پٹنہ کے لوگ خوب سرگرمی سے کام کر رہے ہیں ۔"

چندرکنور :- "کیا سوریں بھی اب سیندور پہنینگی۔ پاسی ٹھاکر دوارے بنوائیں گے ۔"

رکمنی :- "کیوں وہ آدمی نہیں ہیں ایشور نے انھیں نہیں بنایا۔ آپ ہی اپنے مالک کی پوجا کرنا جانتی ہیں۔

چندرکنور :- "چلو ہٹو۔ پاسیوں سے مجھے ملاتی ہو۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

رکمنی :- ہاں تمہارا رنگ ذرا صاف ہے نہ۔ اور گہنے کپڑے سے لیس ہو۔ بس اتنا ہی فرق ہے کہ اور کچھ ۔"

چندرکنور :- "اتنا ہی فرق کیوں ہے۔ زمین کو آسمان سے ملاتی ہو۔ میں چھواہوں کی خاندان میں ہوں۔ معلوم ہے !"

رکمنی :- "ہاں معلوم ہے۔ اور نہیں معلوم تھا۔ تو اب معلوم ہوگیا۔ ٹھاکر صاحب کسی پاسی سے بڑھ کر کشتی لڑیں گے ؟ "اسپر یہ بیڑھی بگیا ہی رکمنی جانتے ہیں۔ میں تو

جانتی ہوں کہ کوئی معمولی ہاسی بھی انھیں بغل میں دبا لیگا۔"

چندر کنور: "منہ میں زبان ہے جو چاہے کہہ لو۔ ہمارے باوا جی پورب میں صوبہ دار تھے۔ ہلوگوں کی پرتاؤ دنیا میں مشہور ہے۔"

برجن: "اچھا اب اس فضیتہ کو جانے دو۔ تم دونوں جب آتی ہو لڑتی ہی آتی ہو۔"

ایک مہینہ اور گذرا۔ برجن کی تازہ نظم خیر مقدم کا پیغام لیکر بالاجی کے پاس پہونچی۔ مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ انھوں نے دعوت قبول کی یا نہیں۔ اہل بنارس راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئے۔ بالاجی روز بروز دکھن کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ آخر لوگوں کو مایوسی سی ہوگئی۔ اور سب سے زیادہ مایوسی برجن کو ہوئی۔

ایک روز جب کسی کو سان و گمان بھی نہ تھا کہ بالاجی بنارس آئینگے پران ناتھ نے آکر کہا "بہن۔ لو خوش ہو جاؤ۔ آج بالاجی تشریف لا رہے ہیں۔"

برجن کچھ لکھ رہی تھی۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑا۔ مادھوی اٹھکر دروازہ کی طرف لپکی۔ پران ناتھ نے مسکرا کر کہا "ابھی آ تھوڑے ہی گئے کہ یوں بے صبر ہوئی جاتی ہو۔"

مادھوی: "کب آئیں گے؟ ادھر ہی سے ہو کر جائینگے نہ؟"

پران ناتھ: "یہی تو نہیں معلوم کدھر سے آئینگے۔ انھیں جلوس اور دھوم دھام سے سخت نفرت ہے۔ اسی لئے پہلے سے آنے کی تاریخ نہیں مقرر کی۔ راجہ صاحب کے پاس آج صبح کو ایک آدمی نے آکر خبر دی کہ بالاجی آرہے ہیں اور کہا ہے کہ میرے استقبال کے لئے دھوم دھام نہو۔ مگر یہاں بنارس کے لوگ اسے کب مانتے ہیں۔ استقبال ہوگا۔ اور دھوم کے ساتھ جلوس نکلیگا۔ اور ایسا شاندار کہ شہر کی تاریخ میں یاد رکھنے کے قابل۔ چاروں طرف آدمی چھوٹے ہوئے ہیں

کہ جوں ہی انھیں آتے دیکھیں ہر ایک محلہ میں ٹیلیفون سے خبر پہونچا دیجائے۔ کالج اور اسکول کے طلبا وردیاں پہنے بیرقیں لئے اشارہ کے منتظر ہیں۔ گھر گھر پھول برسانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بازار میں دوکانیں سجائی جا رہی ہیں۔ شہر میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے"

مادھوی:- "ادھر سے جائینگے تو ہم انھیں روک لیں گے"

پران ناتھ:- "ہم نے کوئی تیاری تو کی ہی نہیں۔ روک کیا لیں گے۔ اور یہہ بھی تو نہیں معلوم کہ کدھر سے جائیں گے۔ رادھا چرن نے دھوکا دیا۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں امرتسر کی طرف سے انکے آنے تک لوٹ آونگا۔ اور ابھی تک انکا کہیں پتہ نہیں غیرہ"

برجن:- (سوچکر) "آرتی اتارنے کا انتظام تو کرنا ہی ہوگا"

پران ناتھ:- "ہاں اب کیا اتنا بھی نہو گا۔ میں باہر فرش وغیرہ بچھواتا ہوں"

پران ناتھ باہر تیاریوں میں مصروف ہوئے۔ مادھوی پھول چننے لگی۔ برجن نے روپہلا تھال دھو دھا کر صاف کیا۔ سیوتی اور چندرا اندر سب چیزیں قرینہ سے رکھنے لگیں۔

مادھوی خوشی کے مارے پھولے نہ سماتی تھی۔ بار بار چونک چونک کر دروازہ کی طرف دیکھتی کہ کہیں وہ آ تو نہیں گئے۔ بار بار کان لگا کر سنتی کہ کہیں باجے کی آوازیں تو نہیں آ رہی ہیں۔ دل مارے خوشی کے دھڑک رہا تھا۔ پھول چنتی تھی۔ مگر دھیان دوسری طرف تھا۔ ہاتھوں میں کتنے ہی کانٹے چبھا لئے۔ پھول کے ساتھ کئی پیڑوں کی شاخیں مروڑ ڈالیں۔ کئی دفعہ شاخوں میں الجھ کر گری۔ کئی دفعہ ساڑھی کانٹوں میں پھنسا دی۔ اسوقت اسکی حالت بالکل بچوں کی سی تھی۔

مگر برجن کا چہرہ بالکل اُداس تھا۔ جیسے بھرا ہوا پیالہ ذرا سا ہلنے سے بھی چھلک پڑتا ہے۔ اسیطرح جوں جوں پُرانی باتیں یاد آتی تھیں اُسکی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے تھے۔ آہ کبھی وہ دن تھے کہ ہم اور وہ بھائی بہن تھے۔ ساتھ کھیلتے تھے۔ ساتھ رہتے تھے۔ یا آج سولہ سال گذر گئے اُنکی صورت دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی۔ تب میں ذرا بھی روتی تو وہ میرے آنسو پونچھتے۔ اور میرا دل بہلاتے۔ اب اُنھیں کیا خبر کہ یہ آنکھیں کتنا روئی ہیں۔ اور اس دل نے کیسے کیسے صدمے اُٹھائے ہیں۔ کیا خبر تھی کہ ہماری قسمتیں ایسے گُل کھلائینگی۔ ایک یوگن ہو جائیگی۔ اور دوسرا سنیاسی۔

یکایک مادھوی کو خیال آیا کہ شبا ما کو شاید بالاجی کے آنے کی خبر نہو ئی ہو۔ برجن کے پاس آکر بولی "بہن ذرا میں چچی کے یہاں جاتی ہوں۔ نہ جانے کسی نے اُنسے کہا یا نہیں"

پران ناتھ باہر سے آرہے تھے۔ یہ سُنکر بولے۔ "وہاں سویرے ہی سب سے پہلے خبر ہو گئی۔ خوب تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بالاجی بھی سیدھے گھر ہی کی طرف جائینگے۔ ادھر سے اب نہ آئینگے"

برجن "تو ہم لوگوں کو چلنا چاہئے۔ کہیں دیر نہو جائے"

مادھوی "آرتی کا تھال لاؤ"

برجن "کون لے چلیگا۔ مہری کو بلالو۔ (چونک کر) ارے! یہ تیرے ہاتھوں میں خون کہاں سے آیا"

مادھوی "او نہہ پھول چنتی تھی۔ کانٹے لگ گئے ہونگے"

چندرا "ابھی نئی ساڑی آئی ہے۔ آج ہی پھاڑ کے رکھدی"

مادھوی "تمہاری بلا سے"

مادھوی نے یہہ کہہ تو دیا۔ مگر آنکھیں پُر آب ہوگئیں۔ چندرا یوں بہت نیک عورت تھی۔ مگر جب سے بابو رادھا چرن نے قومی خدمت کے لئے نوکری سے استعفا دیا وہ بالاجی کے نام سے چڑھتی تھی۔ برجن سے تو کچھ کہہ نہ سکتی۔ مادھوی کو چھیڑتی رہتی تھی۔ برجن نے چندرا کی طرف گھور کر مادھوی سے کہا "جاؤ صندوق سے دوسری ساڑی نکال لو۔ اِسے رکھ آؤ۔ رام رام۔ مار کے ہاتھ چھلنی کر ڈالا"

مادھوی "دیر ہو جائیگی۔ میں یوں ہی چلونگی"

برجن "نہیں ابھی گھنٹہ بھر سے زیادہ مہلت ہے"

یہہ کہکر برجن نے پیار سے مادھوی کا ہاتھ دھویا۔ اُسکے بال گوندھے۔ ایک خوبصورت ساڑی پہنائی۔ چادر اُڑھائی۔ اور اُسے گلے سے لگا کر پُر آب آنکھوں سے تاکتی ہوئی بولی "بہن۔ دیکھو دھیرج ہاتھ سے نہ جائے"

مادھوی مسکرا کر بولی "تم میرے ہی ساتھ رہنا۔ مجھے سنبھالتی رہنا۔ مجھے اپنے دل پر آج بھروسہ نہیں ہے"

برجن سمجھ گئی کہ آج پریم نے مدہوشی کا درجہ اختیار کیا ہے۔ اور شاید یہی اُسکی انتہا ہے۔ آہ! یہہ بادلی بالو کی دیوار کھڑی کر رہی ہے"

تھوڑی دیر میں مادھوی۔ برجن۔ سیوتی۔ چندرا کئی عورتوں کے ساتھ سُبایا کے گھر کو چلیں۔ وہاں کی تیاریاں دیکھیں تو دنگ رہ گئیں۔ دروازہ پر ایک نہایت وسیع شامیانہ کھڑا تھا۔ فرش فروش اور شیشہ و آلات سے آراستہ۔ نوبت بج رہی تھی۔ بڑے بڑے ٹوکروں میں میوے اور مٹھائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شہر کے رؤسا نامدار خوش وضع

لباس پہنے ہوئے استقبال کرنیکو کھڑے تھے فٹن اور گاڑیاں ایک بھی نظر نہ آتی تھیں کیونکہ بالاجی ہمیشہ
پیدل ہی چلا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ گلے میں جھولیاں ڈالے ہوئے دکھائی دیتے تھے جنمیں شاید بالاجی کے
نثار کرنیکے لئے روپے پیسے بھرے ہوئے تھے۔ راجہ دھرم سنگھ کے پانچوں لڑکے رنگین کپڑے پہنے زعفرانی صافے
باندھے۔ ریشمی جھنڈیاں کمر میں کھونسے بگل بجا رہے تھے۔ جوں ہی لوگوں کی نظر برجن
پر پڑی ہزاروں سر فرط ادب سے خم ہو گئے۔ جب یہ خاتونیں اندر گئیں تو وہاں
بھی آنگن اور سائبان اور کمرے دلہن کی طرح سجے ہوئے پائے۔ صدہا عورتیں مبارکباد
گانے کے لئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ پھولوں کے ڈھیر جا بجا پڑے ہوئے تھے۔ سُبا ما ایک سفید
ساڑی پہنے۔ صبر و حلم کی تصویر بنی ہوئی دروازے پر کھڑی تھی۔ برجن اور مادھوی کو دیکھتے ہی
آبدیدہ ہو گئی۔ برجن بولی "چچی آج اس گھر کے بھاگ جاگ گئے" سُباما نے رو کر کہا "تمہاری
بدولت مجھے آج یہہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ ایشور تمھیں اسکا پھل دے"۔
غم نصیب ماں کے تہ دل سے یہہ دعا نکلی۔ ایک غم نصیب ماں کی بددعا نے راجہ
دسرتھ کو بیٹے کے فراق میں شربت مرگ چکھایا تھا۔ کیا سُباما کی یہہ دعا بے اثر رہیگی؟
دونوں ابھی اسی طرح باتیں کر رہی تھیں کہ گھنٹے اور ناقوسوں کی صدائیں آنے
لگیں۔ شور مچا کہ بالاجی آ پہونچے۔ عورتوں نے مبارکباد گانا شروع کیا۔ مادھوی نے
آرتی کا تھال لے لیا۔ اور راستہ کی طرف ٹکٹکی باندھکر دیکھنے لگی۔ ذرا دیر میں وردی پوش
نوجوانوں کی ایک جماعت نظر آئی۔ اسکے بعد ارجن سبھا کے ایکسو پچیس ممبر گھوڑوں پر سوار
دکھائی دیئے۔ اُنکے پیچھے بیشمار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ سارا شہر پھٹ پڑا تھا۔ شانے سے
شانے چھل رہے تھے۔ سمندر کی ایک لہر تھی کہ بڑھتی چلی آتی تھی۔ اس ہجوم میں بالاجی کا
چہرہ ایسا نظر آتا تھا جیسے بادل میں سے چاند نکلا ہو۔ پیشانی پر سُرخ چندن کا تلک تھا۔ اور گردن میں

گیروے رنگ کی ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔

سُباما دروازہ پر کھڑی تھی۔ جوں ہی بالاجی کا چہرہ اُسے نظر آیا ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ دروازہ سے باہر نکل آئی۔ اور سر جھکائے۔ آنکھوں سے موتیاں پروتی بالاجی کی طرف چلی۔ آج اُسنے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔ اور اُسے گلے لگانے کے لئے بیقرار ہو رہی ہے۔
۱

سُباما کو اسطرح آتے دیکھکر سب لوگ رُک گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے کوئی دیوی اُتر آئی ہے۔ چوطرفہ سناٹا چھا گیا۔ بالاجی نے کئی قدم آگے بڑھکر ماں کو پرنام کیا۔ اور اُسکے پیروں پر گر پڑے۔ سُباما نے اُنکا سر اپنی گود میں لے لیا۔ اور اُنکے ماتھے پر کئی بوسے دیئے۔ آج اُسنے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔ اُسپر آنکھوں سے موتیاں برسا رہی ہے۔
۲

اس روح افزا نظارہ کو دیکھکر لوگوں کے دل قومیت کے نشہ سے مدہوش ہو گئے پچاس ہزار گلوں سے آواز آئی "بالاجی کی جے" بادل گرجا۔ اور چاروں طرف سے پھولوں کی برکھا ہونے لگی پھر اُسی طرح دوسری گھن گرج صدا بلند ہوئی "منشی سالگرام کی جے" اور ہزاروں آدمی حب وطن کے نشہ سے مست ہو کر دوڑے اور سُباما کے قدموں کی خاک پیشانی پر ملنے لگے۔ ان نعروں سے سُباما ایسی خوش ہو رہی تھی جیسے مہور کے سُننے سے ناگن متوالی ہو جاتی ہے۔ آج اُسنے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔ اس بیبہا رتن کے ملنے سے وہ رانی ہو گئی ہے۔ اسی رتن کے بدولت آج اُسکے قدموں کی خاک لوگوں کی آنکھوں کا سُرمہ اور ماتھے کا چندن بن رہی ہے۔
۳

عجیب حیات بخش نظارہ تھا۔ بار بار جے جے کار کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اور عالم بالا کے بسنے والوں کو بہارت کی بیداری کا مژدہ سناتے تھے۔ ماں اپنے بیٹے کو کلیجے سے لگائے ہوئے ہے۔ بہت دن کے بعد آج اُسنے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔ وہ لال جو اُسکی جنم بھر کی کمائی تھی۔ پھول چاروں طرف سے نثار ہو رہے ہیں زر و جواہر کی بارش ہو رہی ہے۔ ماں اور بیٹا کمر تک پھولوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایسا پُراثر سین کسکی آنکھوں نے دیکھا ہوگا!

سُباما بالاجی کا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر کی طرف چلی۔ دروازہ پر پہونچتے ہی عورتیں مبارکباد گانے لگیں۔ اور مادھوی سنہرے تھال میں دھوپ۔ دیپ۔ پھولوں سے آرتی اُتارنے لگی۔ برجن نے پھولوں کی مالا اُنکے گلے میں ڈالی۔ وہ مالا جسے مادھوی نے اپنے خون سے رنگا تھا۔ بالاجی نے چشم پُر آب سے برجن کی طرف دیکھکر پرنام کیا۔

مادھوی کو بالاجی کے درشن کی کتنی آرزو تھی۔ مگر اسوقت اُسکی آنکھیں زمین کی طرف جھکی ہوئی ہیں۔ بالاجی کی طرف نہیں تاک سکتی۔ اُسے خوف ہے کہ میری آنکھیں دل کا بھید کھول دینگی۔ اُنمیں پریم رس بھرا ہوا ہے۔ آج پہلی بار مادھوی کے دل میں نئی آرزوئیں پیدا ہوئی ہیں۔ اتبک اُسکی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ بالاجی کا درشن پاؤں۔ مگر آج آرزوؤں نے سر اُبھارا ہے۔ پوری ہونے کے لئے نہیں۔ آج باغ حسرت میں ایک نئی کلی لگی ہے۔ کھلنے کے لئے نہیں۔ بلکہ مُرجھانے کے لئے۔ اور مرجھا کر خاک میں ملجانے کے لئے مادھوی کو کون سمجھائے کہ تو ان آرزوؤں کو دل میں نہ پیدا ہونے دے یہہ آرزوئیں تجھے بہت رُلائنگی۔ تیری محبت خیالی ہے۔ تو اُسکے مزے سے واقف ہے۔ کیا اب واقعی محبت کا مزہ لیا چاہتی ہے!

اُنتیسویں فصل

پریم کا سپنا
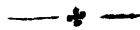
انسان کا دل آرزوؤں کا کاشانہ ہے۔ اور حسرتوں کی لبتی۔ کوئی زمانہ وہ تھا کہ مادھوی ماں کی گود میں کھیلتی تھی۔ اُسوقت دل آرزوؤں اور حسرتوں سے خالی تھا مگر جب مٹی کے گھروندے بنانے لگی۔ اسوقت دل میں یہہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں اپنی گڑیا کا بیاہ کروں۔ سب لڑکیاں اپنی گڑیا بیاہ رہی ہیں۔ کیا میری گڑیا کنواری رہیگی۔ میں اپنی گڑیا کو گہنے بنواؤنگی۔ کپڑے پہناؤنگی۔ اُسکا بیاہ رچاؤنگی۔ اس آرزو نے اُسے مہینوں رُلایا۔ مگر گڑیا کی قسمت میں بیاہ نہ بدا تھا۔ ایک روز بادل گھر آئے اور موسلا دھار پانی برسا۔ گھروندا مینہ میں بہہ گیا۔ اور گڑیے کے بیاہ کی حسرت رہ گئی۔

کچھ دن اور گذرے۔ ماں کے ساتھ برجن کے یہاں آنے جانے لگی۔ اُسکی میٹھی میٹھی باتیں سنتی اور خوش ہوتی۔ اُسکے تھال میں کھاتی۔ اور اُسکے گود میں سوتی۔ اسوقت بھی اُسکے دل میں ایک آرزو تھی کہ میرا خوب اچھا گھر ہوتا۔ اسمیں چاندی کے کیواڑ لگے ہوتے۔ زمین ایسی صاف ہوتی کہ مکھی بیٹھے اور پھسل جاے۔ میں برجن کو اپنے گھر لے جاتی۔ وہاں اچھی اچھی چیزیں بناتی۔ اور کھلاتی۔ اور اچھے سے پلنگ پر سلاتی۔ اور اُسکی خوب سیوا کرتی۔ یہہ آرزو برسوں تک دل میں چٹکیاں لیتی رہی۔ مگر اُسی گھروندے کی طرح یہہ گھر بھی ڈھے گیا۔ اور آرزوئیں مبدل

بہ حسرت ہو گئیں۔

کچھ دن اور گذرے۔ بہار کے دن آئے۔ برجن نے اُسکے دل پر پرتاپ چندر کی تصویر کھینچنی شروع کی۔ ان دنوں اس ذکر کے سوا کوئی بات اچھی نہ لگتی۔ آخر پرتاپ چندر کی چیری بننے کی آرزو دل میں پیدا ہوئی۔ لیٹے لیٹے دل سے باتیں کیا کرتی۔ راتوں کو جاگ جاگ کر من کی مٹھائی کھاتی۔ ان خیالوں سے دل پر ایک نشہ سا ہو جاتا۔ مگر پرتاپ چندر اسی اثنا میں لاپتہ ہو گئے۔ اور اسی مٹی کے گھروندے کی طرح یہ ہوائی قلعے بھی۔ ڈھے گئے۔ آرزوؤں کی جگہ دل میں حسرتیں رہ گئیں۔

اب حسرتوں کی ہجوم سے دل میں آرزوؤنکی جگہ باقی نہ رہی۔ دیوتاؤنکی اُپاسنا کرنے لگی۔ برت رکھنے لگی۔ تاکہ پرتاپ چندر پر زمانہ کی بُری نگاہ نہ پڑنے پائے۔ اسطرح ایک مدت تک اُسنے تپسونی کی زندگی بسر کی۔ خیالی محبت کے نشہ میں چور رہتی۔ مگر آج تپسونی کا برت ٹوٹ گیا۔ اور دل میں نئی آرزوؤں نے سر اٹھایا۔ دس سال کی تپسیا ایک لمحہ میں بھنگ ہو گئی۔ کیا یہ آرزوئیں بھی اُسی مٹی کے گھروندے کی طرح پامال ہو جائینگی؟

آج جب سے مادھوی نے بالاجی کی آرتی اتاری ہے اُسکے آنسو نہیں تھمے۔ سارا دن گذر گیا۔ اور ایک ایک کر کے تارے نکلنے لگے۔ سورج تھک کر چھپ گئے۔ اور چڑیاں تھک کر گھونسلوں میں آبیٹھیں۔ مگر مادھوی کی آنکھیں نہیں تھکیں۔ وہ سوچتی ہے کہ ہائے! کیا میں اسی طرح رونے کے لئے بنائی گئی ہوں۔ میں کبھی ہنسی بھی تھی۔ کہ جسکے بدلے اتنا روتی ہوں۔ آہ۔ روتے روتے آدھی عمر گذر گئی۔ کیا یہ باقی دن بھی یونہی کٹیں گے۔ کیا میری زندگی میں ایک دن بھی ایسا آئیگا جسے یاد کرکے

تسکین ہو کہ مینے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ آج کے پہلے مادھوی کبھی ایسی یاس زدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی خیالی محبت میں مخمور تھی۔ آج اسکے دل میں نئی آرزوئیں پیدا ہوئی ہیں۔ اور یہہ آنسو انھیں کے کرشمے ہیں۔ جو دل سولہ برسوں تک حسرتوں کا آرامگاہ رہ چکا ہو وہی اسوقت مادھوی کے خیالات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

سُبامانکے دل میں بھی آج نئی آرزوں نے سر اُبھارا تھا۔ جب تک بالاجی کو دیکھا نہ تھا سب سے بڑی خواہش یہہ تھی کہ ایک نظر دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کرلیتی۔ آج جب ایک نظر دیکھ لیا تو کچھ اور دیکھنے کی ہوس پیدا ہوئی مگر افسوس! مادھوی کے گھروندے کی طرح خاک میں ملجانے کے لیے۔

آج سُبامان۔ برجن۔ اور بالاجی میں شام تک باتیں ہوتی رہیں۔ بالاجی نے اپنے تجربات بیان کئے۔ سُبامانے اپنی رام کہانی سُنائی۔ اور برجن نے کہا تھوڑا سُنا بہت منشی سنجیون لال کے سنیاس کی خبر پاکر دونوں روئیں۔ جب چراغ جلنے کا وقت آپہونچا تو بالاجی گنگا کی طرف سندھیا کرنے چلے گئے۔ اور سُباما کھانا پکانے بیٹھی۔ آج کتنے دنوں کے بعد وہ من لگا کر کھانا پکا رہی ہے۔

دونوں باتیں کرنے لگیں۔

سُباما۔ بیٹی۔ میری یہہ دلی لالسا تھی کہ میرا لڑکا دنیا میں نیکنام ہو۔ اور ایشور نے میری لالسا پوری کردی۔ پرتاپ نے باپ کا۔ اور خاندان کا نام روشن کر دیا۔ آج جب سویرے میرے پتی کی جے منائی جا رہی تھی تو میرا دل اُمڈا آتا تھا۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ یہہ ویراگ تیاگ دیں۔ دیش کا اُپکار کرنے سے میں انھیں نہیں روکتی۔ مینے تو دیبی جی سے یہی بردان مانگا تھا مگر انھیں سنیاس میں

دیکھکر میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے"

برجن - سُبا ما کا مطلب سمجھ گئی - بولی "جی یہہ بات تو میرے دل میں پہلے ہی سے
جمی ہوئی تھی - موقع پاتے ہی ضرور ذکر کرونگی"

سُباما " موقع شاید ہی ملے انکا کون ٹھکانا - اسیوقت جی میں آوے کہیں چلدیں -
سنتی ہوں سونٹا ہاتھ میں لئے اکیلے جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں مجھسے
اب بیچاری مادھوی کی دشا نہیں دیکھی جاتی - اُسے دیکھتی ہوں تو جیسے کوئی
میرے کلیجے کو کچلنے لگتا ہے - مینے بہت عورتیں دیکھیں - اور بہتوں کا حال
کتابوں میں پڑھا - مگر ایسا پریم کہیں نہیں دیکھا - بیچاری نے آدھی عمر رو رو
کر کاٹ دی - اور کبھی مُنہ سے شکایت کا ایک لفظ نہ نکالا - مینے کبھی اُسے روتے
نہیں دیکھا - مگر رونے والی آنکھیں - اور ھلنے والے مُنہ چھپے نہیں رہتے -
مجھے ایسی ہی بہو کی لالسا تھی - وہ بھی ایشور نے پوری کر دی - تم سے سچ کہتی ہوں
میں اُسے اپنی بہو ہی سمجھتی ہوں - آج سے نہیں برسوں سے"

برج رانی " آج اُسے دن بھر روتے گذرا - بہت اُداس دکھائی دیتی ہے"

سُباما " تو آج ہی اسکا ذکر چھیڑو - ایسا نہو کل کسی طرف کی راہ لیں تو پھر ایک جُگ تک
انتظار کرنا پڑے"

برج رانی - (غور کرکے) " ذکر کرنے کو تو میں کر دوں - مگر مادھوی - خود جیسی خوبی سے
یہہ کام کر سکتی ہے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا"

سُباما " وہ بیچاری اپنی زبان سے کیا کہیگی"

برج رانی " اُسکی آنکھیں آپ ساری رام کہانی کہدینگی"

سُباما۔ وہ اپنے دل میں کیا کہینگے۔"

برجرانی۔ کہینگے کیا، یہہ تمہاری بھول ہے کہ تم مادھوی کو کنواری سمجھ رہی ہو۔ مدت گذری کہ وہ پرتاپ چندر کی دولہن بن چکی۔ ایشور کے یہاں اُسکا بیاہ اُنسے ہو چکا۔ اگر ایسا نہوتا تو کیا دنیا آدمیوں سے خالی تھی۔ مادھوی جیسی عورت کو کون آنکھوں میں نہ بٹھائیگا۔ کیا اُسنے اپنی آدھی جوانی مفت میں رو رو کر گنوائی ہے۔ اُسنے آجتک خیال میں بھی کسی غیر شخص کو جگہہ نہیں دی۔ بارہ برسوں سے تپسوی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ پلنگ پر نہیں سوئی۔ کوئی رنگین کپڑا انہیں پہنا۔ بال تک نہیں گوندھائے۔ کیا یہ سب باتیں نہیں کہتیں کہ مادھوی کا بیاہ اُنسے ہو چکا۔ دلوں کا ملاپ سچا بیاہ ہے سیندور کا ٹیکہ اور گٹھ بندھن اور بھانوریں یہہ سب دنیا کے ڈھکوسلے ہیں۔"

سُباما۔ اچھا جیسا مناسب سمجھو۔ کرو۔ میں صرف جگ ہنسائی سے ڈرتی ہوں۔"

رات کے نو بج گئے تھے۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ مادھوی باغیچہ میں اکیلی بیٹھی ہوئی تاروں کو دیکھتی تھی اور دل میں سوچتی تھی کہ یہہ دیکھنے میں کیسے چمکیلے ہیں۔ مگر کتنے دور۔ کوئی وہاں تک پہونچ سکتا ہے۔ کیا میری امیدیں بھی اُنھیں تاروں کی طرح ہیں۔ اتنے میں برجن نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ مادھوی چونک پڑی۔

برجن۔ "اندھیرے میں بیٹھی یہاں کیا کر رہی ہے؟"

مادھوی۔ "کچھ نہیں۔ تاروں کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ کیسے خوشنما ہیں۔ مگر مل نہیں سکتے۔"

برجن کے کلیجہ میں برچھی سی لگ گئی۔ ضبط کر کے بولی "تارے گننے کا یہہ وقت نہیں ہے۔ جس مہمان کے لیے آج سویرے تک پھولی نہیں سماتی تھی۔ کیا اسیطرح

اُسکی مہمانداری کروگی"

مادھوی "میں ایسے مہمان کی مہمانداری کرنے کے قابل کب ہوں"

برجن "اچھا یہاں سے اُٹھو تو۔ میں مہمانداری کا ڈھنگ بتاؤنگی"

یہہ کہکر برجن نے مادھوی کا ہاتھ پکڑکر اُٹھا دیا۔ دونوں اندر آئیں۔ سُباما کھانا پکا چکی تھی۔ بالاجی کو ماں کا بنایا ہوا کھانا آج مدتوں کے بعد ملا۔ بڑی رغبت سے کھایا۔ سُباما کھلاتی جاتی تھی۔ اور روتی جاتی تھی۔ جب بالاجی کھاپی کر لیٹے تو برجن نے مادھوی سے کہا "اب یہاں کونے میں مُنہ ڈھانپ کر کیا بیٹھی ہو؟"

مادھوی "کچھ دیدو۔ کھاکے سورہوں۔ اب یہی جی چاہتا ہے"

برجن "مادھوی ایسی نراس نہو۔ کیا اتنے دنوں کا برت ایک دن میں بھنگ کردیگی"

✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲

مادھوی اُٹھی مگر دل بیٹھا جاتا تھا۔ جیسے بادلوں کی کالی کالی گھٹائیں اُٹھتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب جل تھل ایک ہوجائیگا۔ مگر یکایک پچھوا ہوا چلنے لگتی ہے۔ اور سارے بادل کائی کی طرح پھٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح اسوقت مادھوی کے دل کی کیفیت ہورہی تھی۔

یہہ مبارک دن دیکھنے کی آرزو اُسکے دل میں کتنے دنوں سے تھی۔ کبھی وہ دن آئیگا کہ میں اُنکے درشن پاؤنگی۔ اور اُنکی امرت کی سی باتیں سنونگی۔ اس دن کے لئے اُسنے کیسی کیسی منتیں مانی تھیں۔ اس دن کے خیال ہی سے اُسکا دل کیسا کھل اُٹھتا تھا۔

آج صبح مادھوی بہت خوش تھی۔ اُسنے بڑے شوق سے پھولوں کا ہار گوندھا تھا۔ سیکڑوں کانٹے ہاتھ میں چبھالئے۔ متوالوں کی طرح گرگر پڑتی تھی۔ یہہ سب

خوشی اور نشہ اسی لئے تو تھا کہ آج وہ مبارک دن آگیا۔ آج وہ دن آگیا جسکی طرف ایک مدت دراز سے آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ زمانہ بھی اب یاد نہیں جب یہ آرزو دل میں نہ رہی ہو۔ مگر اسوقت مادھوی کے دل کی وہ کیفیت نہیں۔ خوشی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ غالباً وہ مادھوی کے خوشی کی انتہا تھی جب وہ باغیچہ میں جھوم جھوم کر پھولوں سے آنچل بھر رہی تھی۔ جسنے کبھی خوشی کا مزہ ہی نہ چکھا ہو اسکے لئے اتنی ہی خوشی معراج کامرانی ہے۔ وہ غریب اس سے زیادہ خوشی کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی۔ جن ہونٹوں پر کبھی ہنسی ہی نہیں آئی انکا مسکرانا ہی ہنسی ہے۔ تم ایسوں سے زیادہ ہنسنے کی امید کیوں رکھتے ہو۔ مادھوی بالاجی کی طرف چلی۔ مگر اسطرح نہیں جیسے ایک نئی نویلی بہو۔ ارمانوں سے بھری ہوئی۔ سنگار کئے اپنے پتی کے پاس جاتی ہے۔ یہی کمرہ تھا جسے وہ اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی تھی۔ جب مندر خالی تھا تب وہ آ آکر اسمیں آنسوؤں کے پھول چڑھاتی تھی۔ آج جب دیوتا نے باس کیا ہے تو وہ کیوں یوں مچل مچل کر آرہی ہے!

رات خوب بھیگ چکی تھی۔ سڑک پر سے ٹریوسے کے گھنٹوں کی آوازیں کان میں آرہی تھیں۔ مادھوی دبے پاؤں بالاجی کے کمرہ کے دروازہ تک گئی۔ اُسکا دل دھڑک رہا تھا۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ کسی نے پیر تھام لئے۔ اُسلٹے قدم لوٹ آئی۔ اور زمین پر بیٹھکر رونے لگی۔ اُسکے دل نے کہا مادھوی! یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ تو بالاجی کی چیری سہی۔ مانا کہ تجھے اُن سے پریم ہے۔ مگر تو اُنکی دلہن نہیں ہے۔ تجھے اسوقت اُنکے کمرہ میں قدم رکھنا ہرگز مناسب نہیں۔ تیرا پریم تجھے اُنکی بیتی نہیں بنا سکتا پریم اور چیز ہے۔ سہاگ اور چیز۔ پریم دل کا جھکاؤ ہے۔ بیاہ ایک پاک فرض ہے۔ تب مادھوی کو

ایک بیاہ یاد آیا۔ دولہے نے بھری سبھا میں دولہن کی بانہہ پکڑی تھی۔ اور کہا تھا کہ اس استری کو میں اپنے گھر کی مالک اور اپنے دل کی دیوی سمجھتا رہونگا۔ اس سبھا کے لوگ۔ اور آکاش۔ اور اگنی اور دیوتا اسکے گواہ رہیں۔ آہ! کیسے مبارک الفاظ ہیں۔ مجھے بھی کبھی یہ الفاظ سننے نصیب ہوئے تھے۔ میں نہ اگنی کو اپنا ساکشی بنا سکتی ہوں۔ نہ دیوتاؤنکو۔ نہ آکاش کو۔ مگر اے اگنی۔ اے آکاش کے تارو۔ اے دیولوک کے باسیو۔ تم شاہد رہنا کہ مادھوی نے بالاجی کی پاک صورت کو دل میں جگہ دی۔ مگر کسی ناپاک خیال کو دل میں نہ آنے دیا۔ اگر میں نے کمرہ کے اندر قدم رکھا ہو تو اے اگنی تم اسیوقت مجھے جلاکر راکھ کردو۔ اے آکاش۔ اگر تونے اپنی ہزار آنکھوں سے بھی مجھے کمرہ میں جاتے دیکھا ہو تو اسیدم مجھپر اندر کا بجر گرادے۔

مادھوی کچھ دیر تک انھیں خیالات میں ڈوبی بیٹھی رہی۔ یکایک اسکے کان میں بھک بھک کی آواز آئی۔ اسنے چونک کر دیکھا تو بالاجی کا کمرہ بہت زیادہ روشن ہوگیا تھا۔ اور کھڑکیوں سے روشنی باہر نکلکر صحن میں پھیل رہی تھی۔ مادھوی کے پیر تلے سے مٹی نکلگئی۔ معاً خیال گذرا کہ میز کا لیمپ بھبک اٹھا۔ ہوا کی طرح وہ بالاجی کے کمرہ میں گھسی۔ دیکھا تو لیمپ زمین پر پھٹ کر گرپڑا ہے۔ اور فرش میں تیل کے پھیل جانے سے آگ لگ گئی ہے۔ دوسرے کنارے پر بالاجی آرام سے سو رہے تھے۔ ابھی تک انکی نیند نہ کھلی تھی۔ انھوں نے قالین سمیٹ کر ایک کونے میں رکھدیا تھا۔ بجلی کی طرح لپک کر مادھوی نے یہہ قالین اٹھالیا۔ اور اسے شعلوں کے اوپر گرادیا۔ دھما کے کی آواز ہوئی تو بالاجی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ کمرہ میں دھواں بھرا ہوا تھا اور چاروں طرف تیل کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ واقعہ کی صورت سمجھگئے بولے۔" بڑی

خیریت ہوئی۔ ورنہ کمرہ میں آگ لگ گئی تھی۔"

مادھوی "جی ہاں ذرا لیمپ گر پڑا تھا۔"

بالاجی "تم بڑے موقع سے آ پہونچیں۔ کیسے معلوم ہوا تھیں؟"

مادھوی "میں یہیں باہر بیٹھی ہوئی تھی۔"

بالاجی "تمکو بڑی تکلیف ہوئی۔ اب جاکر سوؤ۔ رات زیادہ آگئی ہے۔"

مادھوی "چلی جاؤنگی۔ سونا تو روز ہے۔ یہ موقع نہ جانے پھر کب آئے۔"

مادھوی کی آواز میں غضب کا درد تھا۔ بالاجی نے اُسکی طرف غور سے دیکھا۔ اٹھارہ سال پہلے انھوں نے مادھوی کو دیکھا تھا۔ اسوقت وہ ایک کھلتی ہوئی کلی تھی۔ اور آج ایک مرجھایا ہوا پھول۔ نہ چہرہ پر تازگی۔ نہ آنکھوں میں خوشی۔ نہ مانگ میں سہاگ کا ڈورا تھا۔ نہ ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ۔ جسم پر زیور کا نشان بھی نہ تھا۔ بالاجی نے قیافہ سے سمجھا کہ بدھاتا نے عین شباب میں اس دکھیا کا سہاگ ہر لیا ہے۔ بہت مغموم ہوکر بولے "کیوں مادھوی۔ تمہارا بیاہ تو ہو گیا ہے نہ؟"

مادھوی کے کلیجہ میں چھری اُتر گئی۔ آبدیدہ ہوکر بولی۔ "جی ہاں ہو گیا ہے۔"

بالاجی "اور تمہارا پتی؟"

مادھوی "انھیں میری کچھ سُدھ ہی نہیں۔ انکا بیاہ مجھسے نہیں ہوا۔"

بالاجی متحیر ہوکر بولے "تمہارا پتی کرتا کیا ہے؟"

مادھوی "دیش کی سیوا۔"

بالاجی کے آنکھوں کے سامنے سے ایکبارہ وہ سا ہٹ گیا۔ مادھوی کا مطلب سمجھ گئے۔ پوچھا۔

"مادھوی! اس بیاہ کو کتنے دن ہوئے ؟"

مادھوی:- "مجھے کچھ یاد نہیں۔ بہت دن ہوئے۔ شاید اٹھارہ بیس سال"

بالاجی کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ اور چہرہ پر قومی غرور کا نشہ سا چھا گیا۔ بھارت ماتا! آج اس گئے گذرے زمانہ میں بھی تمہاری گود میں ایسی ایسی دیویاں کھیل رہی ہیں جو ایک خیال پر اپنی جوانی۔ اور زندگی کی آرزوئیں قربان کر سکتی ہیں۔ بولے "ایسے پتی کو تم تیاگ کیوں نہیں دیتیں؟"

مادھوی نے بالاجی کی طرف پُر غرور نگاہوں سے دیکھا اور بولی "سوامی آپ اپنی زبان سے ایسا نہ فرمائیں۔ میں ہندو عورت ہوں۔ میں نے گاندھاری ساوتری کے کُل میں جنم لیا ہے۔ جسے ایکبار دل سے اپنا پتی مان چکی اُسے نہیں سکتی۔ اگر میری زندگی یونہی روتے روتے کٹ جائے تو بھی اپنے پتی کی طرف مجھے مطلق ملال نہوگا۔ جب تک میرے تن میں جان رہیگی میں ایشور سے اُنکی بھلائی چاہتی رہونگی۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ ایسے مہاتما کے پریم نے میرے دل میں باس کیا۔ میں اسی کو اپنا سوبھاگیہ سمجھتی ہوں۔ آج اٹھارہ سال سے زیادہ ہوا کہ میں نے بناؤ سنگار کا خیال تک دل میں نہیں آنے دیا۔ میں نے ایکبار اپنے سوامی کو دور سے دیکھا تھا۔ اور وہ تصویر ایک دم کے لئے بھی میری نگاہوں سے نہیں اُتری۔ جب کبھی میں بیمار ہوئی ہوں اُسی تصویر نے میری تیمارداری کی ہے۔ جب کبھی میں نے بیوگ کے دُکھ سے بیچین ہو کر آنسو بہائے ہیں اُسی تصویر نے مجھے ڈھارس دیا ہے۔ اُس کو میں کیسے تیاگ دوں۔ میں اُسکی ہوں اور ہمیشہ اُسیکی ہونگی۔ میرا دل اور میری جان اُسکے نذر ہو چکے۔ اگر وہ کہے تو آج میں آگ کے گود میں ایسی خوشی سے

جا بیٹھوں گویا پھولوں کا سیج ہے۔ اگر میری جان اُسکے کسی کام آئے تو میں ایسی خوشی سے دیدونگی جیسے کوئی اُپاسک دیوتا پر پھول چڑھا دیتا ہے۔"

مادھوی کا چہرہ جوش سے گلگوں ہو رہا تھا۔ بالاجی نے اُسکی باتیں سنیں اور دم بخود ہو گئے۔ یہہ وہ عورت ہے جسنے صرف میرے خیال پر اپنی زندگی قربان کر دی ہے۔ اس خیال سے بالاجی کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ جس پریم نے ایک عورت کی زندگی جلا کر خاک کر دی ہو اُسکے لئے ایک آدمی کے استقلال کو جلا ڈالنا کوئی بڑی بات نہیں۔ پریم کے مقابلہ میں ضبط کوئی چیز نہیں ہے۔ بولے "مادھوی! تم جیسی دیویاں بھارت کے لئے سرمایہ ناز ہیں۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ تمہارے پریم جیسی انمول چیز یوں میرے ہاتھ آ رہی ہے۔ اگر تمنے میرے لئے جوگنی بننا پسند کیا ہے تو میں بھی تمہارے لئے اس سنیاس اور ویراگ کو خیرباد کہہ سکتا ہوں جسکے لئے تمنے اپنے تئیں مٹا دیا ہے۔ وہ تمہارے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے بھی نہ ہچکچائیگا۔"

مادھوی نے فوراً جواب دیا۔ وہ اس جواب کے لئے پہلے ہی سے تیار تھی۔

سوامی جی! میں بہت کمزور اور بے عقل عورت ہوں۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ذاتی آرام کا خیال آجتک ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دل میں نہیں آیا۔ اگر آپنے یہہ خیال کیا کہ میرے پریم کا معراج صرف یہہ ہے کہ آپ کے پیروں میں سنسار کے بندھنوں کی بیڑیاں ڈالدوں تو (ہاتھ جوڑ کر) آپنے اسکی حقیقت بالکل غلط سمجھی۔ میرے پریم کا معراج وہی تھا جو آج مجھے حاصل ہو گیا۔ آج کا دن میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے۔ آج میں اپنے پران ناتھ کے سامنے کھڑی ہوں۔ اور اپنے کانوں سے اُنکی امرت مئی باتیں سُن رہی ہوں۔ سوامی جی! مجھے اُمید نہ تھی کہ

اس زندگی میں مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہوگا۔ اگر میرے پاس دنیا کا راج ہوتا تو میں
اس خوشی میں اُسے آپ کے قدموں پر نثار کر دیتی۔ میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے منت کرتی
ہوں کہ مجھے اب چرنوں سے الگ نہ کیجئےگا۔ میں سنیاس لے لونگی اور آپ کے ساتھ
رہونگی۔ میں ویراگن ہونگی۔ بھبوت رماؤنگی۔ مگر آپ کا ساتھ نہ چھوڑونگی۔ پران ناتھ!
میں نے بہت دکھ سہے ہیں۔ مگر اب یہ جلن نہیں سہی جاتی۔

یہ کہتے کہتے مادھوی کا گلا رندھ گیا۔ اور آنکھوں سے پریم کی دھارا بہنے لگی۔
اُس سے وہاں نہ بیٹھا گیا۔ اُٹھ کر پرنام کیا۔ اور برجن کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ برج رانی نے
اُسے گلے لگا لیا اور پوچھا۔ کیا بات چیت ہوئی؟

مادھوی "جو تم چاہتی تھیں"

برج رانی "سچ! کیا بولے؟"

مادھوی "یہ نہ بتلاؤنگی"

برج رانی کو گویا پڑی دولت مل گئی۔ بولی۔ ایشور نے بہت دنوں میں میرا حوصلہ
پورا کیا۔ میں اپنے یہاں سے بیاہ کرونگی" مادھوی مایوسانہ انداز سے مسکرائی۔ برجن
نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا" ہم کو بھول تو نہ جائیگی۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے"
پھر آواز سنبھال کر بولی" تو ہم سے اب بچھڑ جائیگی"

مادھوی "میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤنگی"

برجن "چل باتیں نہ بنا"

مادھوی "دیکھ لینا"

برجن "دیکھا ہے۔ جوڑا کیسا پہنیگی"

مادھوی:۔ "سفید جیسے بگلے کا پر۔"

برجن:۔ "سہاگ کا جوڑا کیسریئے رنگ کا ہوتا ہے۔"

مادھوی:۔ "میرا اُجلا رہیگا۔"

برجن:۔ "تجھے چندر ہار بہت پسند تھا۔ میں اپنا دیدونگی۔"

مادھوی۔ (مسکراکر) "ہار کی جگہ کنٹھی دیدینا۔"

برجن:۔ "کیسی باتیں کر رہی ہے؟"

مادھوی:۔ "اپنے سنگار کی۔"

برجن۔ تیری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ تو اسوقت اتنی اُداس کیوں ہے۔ تونے اس رتن کے لئے کیسی کیسی تپسیا کی۔ کیسا کیسا جوگ سادھا۔ کیسے کیسے برت رکھے۔ اور آج جب وہ رتن ملگیا تو تو خوش نہیں دکھائی دیتی۔"

مادھوی:۔ "تم بیاہ کی بات چیت کرتی ہو۔ اس سے مجھے صدمہ ہوتا ہے۔"

برجن:۔ "یہی تو خوش ہونے کی بات ہے۔"

مادھوی۔ بہن میرے بھاگ میں وہ خوشی لکھی ہی نہیں۔ جو چڑیا بادلوں میں گھونسلا بنانا چاہتی ہے۔ وہ سدا ڈالیوں پر رہیگی۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ زندگی کے یہ چند سال اسی طرح پریم کا سپنا دیکھنے میں کاٹ دوں۔"
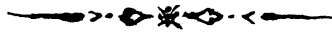
تیسویں فصل

الوداع
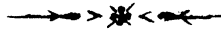
دوسرے دن بالاجی اسنان دھیان سے فارغ ہوکر راجہ دھرم سنگھ کا انتظار کرنے لگے۔ آج راج گھاٹ پر ایک عظیم الشان گوشالہ کی نبیاد پڑنیوالی تھی۔ شہر کے کوچہ و بازار مسکراتے نظر آتے تھے۔ سڑک پر دورویہ بیرقیں اور جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ سڑکیں نہادھوکر اپنا سینہ فرش راہ کئے ہوئے تھیں۔ دروازے پھولوں کی مالا گلے میں ڈالے خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ آج اُس حبیب وطن کی آمد ہے جسنے اپنا سب کچھ ملک پر قربان کردیا ہے۔

خوشی کی دیوی اپنے سکیوں سہیلیوں کے ساتھ محو خرام تھی۔ ہوا مستی سے جھومتی پھرتی تھی۔ رنج وغم کا کہیں نشان نہ تھا۔ جابجا نوبت جھڑ رہی تھی۔ مرد خوش وضع لباس زیب تن کئے اٹھلاتے تھے۔ عورتیں سولہوں سنگار کئے منگل گیت گاتی تھیں لڑکے زعفرانی صافے باندھے کلیلیں کرتے تھے۔ ہر مرد و زن کے چہرہ سے خوشی جھلک رہی تھی۔ کیونکہ آج قوم کے ایک سچے جاں نثار کی آمد ہے جسنے اپنا سب کچھ قوم کے نظر کردیا ہے۔

بالاجی جب اپنے جاں نثار رفیقوں کے ساتھ راج گھاٹ کی طرف چلے تو سورج نے گوشۂ مشرق سے نکلکر اُنکا استقبال کیا۔ اُنکا مردانہ چہرہ جوں ہی لوگوں نے دیکھا

ہزاروں زبانوں سے "بھارت کی جے" کا پرجوش نعرہ نکلا۔ اور فضائے آسمان کو چیرتا ہوا گنبد گردوں تک جا پہونچا۔ گھنٹے اور ناقوس کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اور مسرت کے دلاویز نغمے ہوا میں گونجنے لگے۔ جسطرح شمع کو دیکھتے ہی پروانے اُسپر نثار ہونے کو ٹوٹ پڑتے ہیں اُسی طرح بالاجی کو دیکھکر لوگ بڑی تیزی سے اُنکے چاروں طرف جمع ہوگئے۔ ارجن سبھا کے سوا سو ممبروں نے باقاعدہ سلام کیا۔ اُنکی خوشنما وردیاں۔ اور سبکخرام گھوڑے نظروں میں کھبے جاتے تھے۔ اس جماعت کا ایک ایک ممبر قوم کا سچا جاں نثار تھا۔ اور اُنکے پرجوش نعرے لوگوں کے دلوں کو حوصلے سے لبریز کئے دیتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ نوبتیں جھڑ رہی تھیں پھول اور میوے برس رہے تھے۔ جابجا شہر کی للنائیں سنگار کئے۔ سنہرے تھالوں میں کافور پھول اور صندل لئے آرتی اُتارتی جاتی تھیں۔ دوکانیں عروس زیبا کی طرح آراستہ تھیں۔ سارا شہر رشک چمن بنا ہوا تھا۔ اور جسطرح ساون کے مہینہ میں کالی کالی گھٹائیں اُٹھتی ہیں۔ اور رہ رہ کر رعد کی گھن گرج صدا دلوں کو ہلا دیتی ہے۔ اُسی طرح اس خلقت بے پایاں کی زبانوں سے "بھارت کی جے" کی حوصلہ خیز آوازیں دلوں میں ولولہ اور گرمی پیدا کر رہی تھیں۔ جب بالاجی چوک میں پہونچے تو ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ پانچسو نوعمر لڑکے اودے رنگ کے لیس دار کوٹ پہنے زعفرانی رنگ کے پیچدار صافے باندھے۔ اور ہاتھوں میں خوبصورت سونٹے لئے سرراہ کھڑے تھے۔ بالاجی کو دیکھتے ہی وہ دس دس کی قطاروں میں ہوگئے۔ اور اپنے ڈنڈے بجابجا کر یہ پراثر گیت گانے لگے۔

بالاجی تیرا آنا مبارک ہووے

دھن دھن بھاگ ہیں اس نگری کے * دھن دھن بھاگ ہمارے

دھن دھن اس نگری کے باسی * جہاں تیرے چرن پدھارے

بالاجی تیرا آنا مبارک ہوئے

کیسا نظارہ دلکشا تھا۔ نغمہ اگرچہ سادہ تھا۔ مگر متعدد اور موزوں آوازوں نے ملکر اُسے بلاکا دلکش اور پُراثر بنا دیا تھا۔ لوگوں کے قدم وہیں جم گئے۔ اور چہار طرف سناٹا چھا گیا۔ خموشی میں یہ ترانہ ایسا ہی سہانا معلوم ہوتا تھا جیسے رات کے سناٹے میں نغمۂ عندلیب۔ سارا عالم نقش حیرت بنا کھڑا تھا۔ غریب بھارت باسیو! تم نے ایسے نظارے کہاں دیکھے۔ اسوقت خوب سیر ہو کر دیکھ لو۔ تم رقاصان دلنواز کی نغمہ سرائیوں سے آسودہ ہو گئے۔ حسینوں کی نازک ادائیاں بہت دیکھ چکے۔ گل و گلشن کی بہت سیریں کیں مگر وہ مسرت علوی۔ وہ حوصلہ طرب تیز جو اسوقت تم محسوس کر رہے ہو تمھیں کبھی اور بھی حاصل ہوا تھا۔ رقاصان دلنواز کے نغمے اور حسینوں کی نازک ادائیاں اور گل و گلشن کی سیریں تمہارے نفس کو خوش کرتی ہیں۔ مگر تمہارے حوصلوں کو پست اور کمزور بنا دیتی ہیں۔ لیکن ایسے نظارے تم میں قومیت اور قومی جوش اور قومی ہمدردی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اگر تم نے اپنی زندگی میں ایکبار بھی یہ نظارہ دیکھا ہے تو اُسکا پاک نقش تمہارے دلوں سے کبھی نہ مٹیگا۔

بالاجی کا وجیہ چہرہ روحانی مسرت کے روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں سے سچے قومی غرور کی شعاعیں نکل رہی تھیں جسطرح کسان اپنے لہلہاتے ہوئے کھیت کو دیکھکر خوشی کے نشہ سے متوالا ہو جاتا ہے۔ وہی کیفیت اسوقت بالاجی کی تھی۔ جب نغمہ بند ہو گیا تو اُنھوں نے چند قدم آگے بڑھکر دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو اُٹھا کر اپنے کندھو پر

بٹھالیا۔ اور ایک عالم مستی میں زور سے نعرہ لگایا "بھارت ماتا کی جے"!

اسطرح خراماں خراماں لوگ راج گھاٹ پر پہونچے۔ یہاں گوشالہ کی ایک شاندار۔ سربفلک عمارت استقبال کے لیئے کھڑی تھی۔ صحن میں مخملی فرش بچھا ہوا تھا۔ محرابیں۔ ستون، اور دروازے خوشنما پھولوں اور پتیوں سے سجے ہوئے تھے۔ مکان کے اندر کئی ہزار گائیں بندھی ہوئی تھیں۔ بالاجی نے اپنے ہاتھوں سے انکے ناندوں میں کھلی اور بھوسہ ڈالا۔ انھیں پیار سے تھپکیاں دیں۔ ایک وسیع کمرہ میں سنگ مرمر کا ایک حوض بنا ہوا تھا۔ دودھ سے لبریز۔ بالاجی نے ایک چلو دودھ لیکر آنکھوں سے لگایا۔ اور پی گئے۔ اسکے بعد ہزاروں آدمی اس چشمہ آب حیات سے فیضیاب ہوئے۔

ابھی صحن میں لوگ اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ کئی آدمی بدحواس دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ پنڈت بدلو شاستری۔ سیٹھ اُتم چند اور لالہ مکھن لال باہر کھڑے غل مچارہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمکو بالاجی سے دو دو باتیں کر لینے دو۔ بدلو شاستری بنارس کے نامی گرامی پنڈت تھے۔ خوبصورت ہلالی تِلک لگاتے۔ سبز بانات کی مرزائی پہنتے اور بسنتی پگڑی باندھتے تھے۔ اُتم چند اور مکھن لال دونوں شہر کے رئیس اعظم لکھپتی آدمی تھے۔ خطاب کے لیئے ہزاروں لاکھوں خرچ کرتے۔ اور اعلیٰ عہدہ داروں کی تواضع و تکریم و خاطر مدارات کو فرض اولیٰ سمجھتے تھے۔ ان حضرات کا شہر کے آدمیوں پر بڑا دباؤ تھا۔ بدلو شاستری جب کبھی شاستراتھ کرتے تو یہ یقینی بات تھی کہ فریق ثانی کی خیریت نہیں۔ خصوصاً بنارس کے پنڈے اور پراگوال اور اسی قبیل کے دوسرے مفت خور تو اُنکے پسینہ کی جگہہ خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ شاستری جی بنارس میں سناتن دھرم کے وکیل اور رُکن اعظم مشہور تھے۔ اُتم چند

اور مکھن لال بھی مذہبی جوش وخروش سے لبریز تھے۔ اسوقت اُنکی تشریف آوری فتنہ انگیزی سے خالی نہ تھی۔ سناتن دھرم کا فرض اولیں تمدن کے نقائص کی حمایت کرنا ہے۔ اور چونکہ بالاجی اصلاح کے پُرزور حامی تھے۔ اسلئے اُنکی مخالفت کرنا اور انھیں زک دینا سناتن دھرم کے اراکین کا فرض مذہبی تھا۔ بالاجی کی روز افزوں کامیابیوں کو دیکھ دیکھکر اُنکے کلیجے پر سانپ لوٹتا رہتا تھا۔ اور یہ لوگ عرصہ سے بالاجی کے ساتھ شاستر ارتھ کرنے۔ یا بہ الفاظ دیگر۔ فوجداری کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہے تھے۔ آج اُنکی دلی مُرادیں برآئیں۔ پنڈوں اور پراگوالوں کی ایک جمعیت کثیر لیکر آپہونچے۔

بالاجی نے ان مہاتماؤں کے آنے کی خبر سُنی تو باہر نکل آئے۔ مگر یہاں کی کیفیت دیکھی تو ہوش اُڑ گئے۔ طرفین کے لوگ لاٹھیاں سنبھالے۔ آستین چڑھائے گتھنے کو تیار کھڑے تھے۔ شاستری جی پراگوالوں کو وار کرنے کے لئے للکار رہے تھے۔ اور سیٹھ جی باآواز بلند فرمارہے تھے کہ ان شودروں کی دھجیاں اُڑا دو۔ ہم عدالت میں دیکھ لیں گے۔ تمہارا بال بیکا نہونے پائیگا۔ مکھن لال صاحب بھی گلے پھاڑ پھاڑ کر فرماتے تھے کہ نکل آئے جسے ہوتا ہو۔ ایک ایک کو سبز باغ دکھا دونگا۔ بالاجی نے جب یہ رنگ دیکھا تو راجہ دھرم سنگھ سے بولے آپ بدلو شاستری کو جاکر سمجھا دیجئے کہ اس شر و فساد سے باز آئیں۔ ورنہ طرفین کا نقصان ہوگا۔ اور جگ ہنسائی ہوگی وہ الگ۔ راجہ صاحب کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔ بولے اس شخص سے بات کرنا میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ اُسے پراگوالوں کی جمعیت پر غرہ ہے۔ مگر میں آج اُنکی ساری شیخی کرکری کئے دیتا ہوں۔ اُنکا منتا بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ آپ پروا کریں

مگر جب تک میں اور میرے پانچوں بیٹے زندہ ہیں کوئی آپ کی طرف آنکھ نہیں اُٹھا سکتا۔ بس آپ کے ایک اشارہ کی دیر ہے۔ اور میں دم کی دم میں انھیں اس شرارت کا مزہ چکھا دونگا۔

بالاجی سمجھ گئے کہ یہ شیر بپھر گیا ہے۔ اس سے مصالحت کی اُمید رکھنی فضول ہے۔ راجپوت جب بپھرتا ہے تو اُسے مرنے مارنے کے سوائے اور کوئی خیال نہیں رہتا۔ بولے "راجہ صاحب! آپ دور اندیش ہوکر ایسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ آگے بڑھکر اپنے آدمیوں کو روکیے۔ ورنہ نتیجہ بہت بُرا ہو جائیگا"

بالاجی یہ کہتے کہتے یکایک رُک گئے۔ سمندر کی لہروں کی طرح لوگ ادھر اُدھر سے اُمڈتے چلے آتے تھے۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ اور آنکھوں میں خون کی سُرخی۔ چہرے غضبناک۔ تیوروں پر بل پڑے ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے یہ جماعت کثیر راگوالوں کے سر پر پہونچ گئی۔ اور قریب تھا کہ لاٹھیاں سروں کا بوسہ لیں اور سنگینیں کلیجوں میں چُبھیں کہ بالاجی بجلی کی طرح کوند کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اور نہایت پُرزور لہجہ میں فرمایا۔

"بھائیو! یہ کیا اندھیر ہے۔ اگر مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو تو فوراً ہاتھ نیچے کرلو۔ اور پیروں کو ایک انچ آگے مت بڑھنے دو۔ مجھے فخر ہے کہ تمہارے دلوں میں مردانہ غصہ اور جوش موجزن ہو رہا ہے۔ مردانہ غصہ ایک پاک جذبہ اور مقدس جوش ہے۔ مگر مردانہ ضبط اُس سے بھی زیادہ پاک اور مقدس فرض ہے۔ اسوقت اپنے غصہ کو ضبط سے روکو۔ کیا تم اپنے قوم کے ساتھ کل فرائض ادا کر چکے کہ یوں جان دینے پر آمادہ ہو۔ کیا تم مشعل لیکر بھی کنوئیں میں گرنا چاہتے ہو۔ یہ لوگ تمہارے ہموطن۔ تمہارے بھائی۔ تمہارے ہی خون ہیں۔ انھیں اپنا دشمن مت سمجھو۔ اگر وہ جاہل ہیں تو اُنکی جہالت کو دور کرنا تمہارا فرض ہے۔ اگر وہ تمھیں گالیاں

مگر بالا رندور کر اُس سے ایک دن کا دُکھ بھی نہ جھیلا گیا۔

سُہانے راگوں کے الاپ سے مکان گونج رہا تھا کہ یکایک سدیا کی خبریاں بھی پہونچی۔ اور راجہ دھرم سنگھ یہ کہتے ہوئے سُنائی دیئے "آپ لوگ بالاجی کو رخصت کرنے کے لئے تیار ہوجائیں۔ وہ اسیوقت سدیا جا رہے ہیں"

یہ سُنتے ہی آدھی رات کی سی خموشی چھا گئی۔ سُبا ما گھبرا کر اُٹھی اور دروازہ کی طرف لپکی۔ گویا وہ بالاجی کو روک لیگی۔ اُسکے ساتھ سب کی سب عورتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور اُسکے پیچھے پیچھے چلیں۔ برج رانی نے کہا "چچی! کیا اُنھیں زبردستی رخصت کروگی۔ ابھی تو وہ اپنے کمرے ہی میں ہیں"

سُبا ما "میں اُنھیں نہ جانے دونگی۔ رخصت کرنا کیسا؟"

برج رانی "اُنکا سدیا جانا ضروری ہے"

سُبا ما "میں کیا سدیا کو لیکر چاٹونگی بھاڑ میں جائے۔ آخر میں بھی تو کوئی ہوں میرا بھی تو اُن پر کوئی حق ہے"

برج رانی "تمھیں میری قسم اسوقت اس قسم کی باتیں نکرنا۔ ہزاروں آدمی محض انکے بھروسے پر جی رہے ہیں۔ یہ نہ جائینگے تو قہر ہوجائیگا"

محبت مادرانہ انسانیت اور قومیت کے احساس پر غالب آگئی۔ مگر برج رانی نے سمجھا کر روک لیا۔ سُبا ما اس واقعہ کو یاد کرکے ہمیشہ افسوس کرتی تھی۔ اُسے تعجب ہوتا تھا کہ میں آپ سے باہر کیوں ہوگئی تھی۔ رانی صاحبہ نے پوچھا "برجن! بالاجی کو جیمال کون پہنائیگا"

برجن "آپ"

رانی صاحبہ "اور تم کیا کروگی"

برجن "میں اُنکے ماتھے پر تیلک لگاونگی"

رانی صاحبہ "مادھوی کہاں ہیں"

برجن۔ (آہستہ سے) "اُسے نہ چھیڑو۔ بیچاری اپنے خیال میں مگن ہے"

اسی اثنا میں بالاجی باہر نکلے۔ اُنھیں دیکھتے ہی لوگوں سنے پُرجوش نعرہ مارا "بھارت کی جے"۔ عورتیں بھی اُنکی طرف بڑھیں بالاجی نے سُباما کو دیکھا تو نزدیک آکر اُسکے قدم چوم لئے سُباما نے اُنھیں اُٹھاکر چھاتی سے لگایا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر د فور جذبات نے زبان نہ کھلنے دی۔ رانی صاحبہ پھولوں کا جیمال لیکر چلیں کہ اُنکے گلے میں ڈالدوں۔ مگر پیر تھرائے اور آگے نہ بڑھ سکیں۔ برج رانی چندن کا تھال لیکر چلی۔ مگر آنکھیں ندی کی طرح اُمڈ آئیں۔ اور دل بیٹھ گیا۔ تب مادھوی چلی۔ اُسکے آنکھوں میں پریم کی چمک تھی اور چہرہ پریم کی سُرخی۔ ہونٹوں پر دلاویز مسکراہٹ۔ جھلک رہی تھی۔ اور دل پریم کے نشہ میں مگن تھا۔ اُسنے بالاجی کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جو اتھاہ محبت سے لبریز تھیں اور تب سر نیچا کر کے پھولوں کا جیمال اُنکے گلے میں ڈالدیا۔ ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگایا۔ اور پریم کا بیڑا ہاتھ میں دیدیا۔ مراسم ظاہری کی کسر تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔ اُسوقت بالاجی نے گہری سانس لی۔ اور اُنھیں معلوم ہوا کہ میں پریم کے اپار سمندر میں بہا جا رہا ہوں۔ ضبط کا لنگر اُکھڑ گیا۔ اور اُس شخص کی طرح جو یکایک پانی میں پھسل پڑا ہو۔ اُنھوں نے بے اختیار مادھوی کی بانہہ پکڑ لی۔ مگر آہ! جس تنکے کا اُنھوں نے سہارا لیا وہ خود پریم کی دھار میں تیزی سے بہا جا رہا تھا۔ اُنکا ہاتھ پڑتے ہی مادھوی کے رگ رگ میں بجلی سی کوند گئی۔ بدن میں پسینہ آگیا۔ اور جسطرح ہوا کے جھونکے سے پنکھڑیوں پر جمے ہوئے شبنم کے قطرے زمین پر گر پڑتے ہیں اُسی طرح مادھوی کے آنکھوں سے آنسو کی بوندیں بالاجی کے ہاتھ پر ٹپک پڑیں۔ یہ پریم کے موتی تھے جو ان متوالی آنکھوں نے بالاجی کے بھینٹ کئے ہیں۔ آج سے یہ آنکھیں پھر

دینگی۔

آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ اور اُنکی آڑ میں بیٹھی ہوئی دیویاں یہہ نظارہ ء رہی تھیں۔ آج صبح بالاجی کے خیر مقدم میں یہہ نغمہ گایا گیا تھا۔

بالاجی تیرا آنا مبارک ہوئے

اور اسوقت عورتیں اپنے دلکش اور من بھانے سروں میں گا رہی ہیں۔

بالاجی تیرا جانا مبارک ہوئے

آنا بھی مبارک تھا۔ اور جانا بھی مبارک ہے۔ آنے کے وقت بھی آنکھوں سے ونکلے تھے۔ اور جانے کے وقت بھی نکل رہے ہیں۔ کل وہ مہمان کا خیر مقدم کرنیکے آئے تھے۔ آج اُسکا الوداع کر رہے ہیں۔ اُنکا رنگ روپ بالکل یکساں ہے۔ یمیں کتنا فرق ہے!

اکتیسویں فصل

متوالی جوگن

مادھوی پہلے ہی سے مرجھائی ہوئی کلی تھی۔ حسرت نے اُسے خاک میں ملا دیا۔ سال کی تپسونی۔ جوگن بنگئی۔ اُس غریب کی بھی کیا زندگی تھی۔ کہ یا تو دل میں کوئی آرزو نہیں ہوئی یا ہوئی تو قسمت نے اُسے پھولنے پھلنے نہ دیا۔ اُسکا پریم عشق کا دریا سے پئے کنا ۔ اسمیں ایسا سیلاب آیا کہ زندگی کی آرزوئیں اور حسرتیں فنا ہوگئیں۔ اُسنے جوگنوں کے

بستر پہن لئے۔ اور علایق دنیا سے آزاد ہو گئی۔ دنیا انھیں ارمانوں اور آرزوؤں کا دوسرا نام ہے۔ جسنے انھیں گور حسرت میں دفن کر دیا اُسے دنیا میں سمجھنا بھول ہے۔

اس پریم کے نشہ سے متوالی جوگن کو ایک جگہ قیام نہ تھا۔ بوئے گل کی طرح دیس دیس پھرتی اور پریم کے شبد سناتی پھرتی تھی۔ اُسکے زرد چہرہ پر گیروے رنگ کی کفنی بہت سہانی معلوم ہوتی تھی۔ یہ پریم کی مورت دیکھکر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ جب وہ اپنی بین پر کوئی بھجن گانے لگتی تو سننے والوں کے دل پریم اور انوراگ سے سرشار ہو جاتے تھے اسکا ایک ایک شبد پریم رس میں ڈوبا ہوتا تھا۔

متوالی جوگن کو بالاجی کے نام سے عشق تھا۔ وہ اپنے پدوں میں اکثر انھیں کی کیرت سناتی تھی۔ جس دن سے اُسنے جوگیا بھیس لیا۔ اور لوک لاج کو پریم پر نچھاور کر دیا اُسی دن سے اسکی زبان پر گویا سرسوتی بیٹھ گئیں۔ اُسکے رسیلے پد سننے کو لوگ سیکڑوں کوس چلے آتے تھے۔ جسطرح بنسی کی صدا سنتے ہی گوپیاں گھروں سے بیقرار ہو کر نکل پڑتی تھیں اُسی طرح اس جوگن کی تان سنتے ہی انسانوں کا ایک دریا امڈ پڑتا۔ اسکے پد سننا آنند کے پیالے پینا تھا۔

اس جوگن کو کسی نے ہنستے یا روتے نہیں دیکھا۔ اُسے نہ کسی بات کا رنج تھا۔ نہ کسی کی خوشی۔ جس دل میں آرزوئیں نہ ہوں وہ کیوں ہنسے۔ اور کیوں روئے۔ اُسکا چہرہ آنند کی تصویر تھا اُسپر نگاہ پڑتے ہی دیکھنے والوں کی آنکھیں پاک سرور سے لبریز ہو جاتی تھیں